یعنی

"حیاتِ شبلی" مصنفہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی
پر سیر حاصل، بے لاگ اور محققانہ تبصرہ

از

مولوی محمد امین زبیری مارہروی

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

پہلی اشاعت سنہ ۱۹۴۶ء

مطبوعہ ادبی پریس لکھنؤ

قیمت فی جلد عہ

گزارش

اُردو زبان میں ایک اُردو سوانح عمری (حیاتِ شبلی) پر اتنا طویل تبصرہ غالباً پہلی مرتبہ پیش ہو رہا ہے۔ مگر یہ طوالت ناگزیر تھی۔

مصنف حیات یعنی علامہ، ڈاکٹر ناظم دار المصنفین (قاضی القضاۃ و امیر جامعہ احمدیہ بھوپال) مولانا سید سلیمان ندوی نے واقعہ آفرینی، مسخ حقیقت التباس حق و باطل کا وہ کمال دکھایا ہے کہ اسکی اصلیت بے نقاب کرنے کیلئے ناقابل تردید ثبوت اور مستند حوالوں کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کا بغیر طویل اقتباسات کے پورا ہونا ممکن نہ تھا۔

علامہ ممدوح خود ہی دُنیائے علم و ادب میں ایک زبردست شخصیت و شہرت کے مالک ہیں اُس پر مستزاد یہ کہ اُن بیانات پر ایک دوسرے رفیع المرتبت ذی علم اور مشہور و ممتاز بزرگ نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمن خان شروانی سابق صدر الصدور امور مذہبی دولت آصفیہ و سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی توثیق ہے اگرچہ وہ ایک نئی بدعت ہے تاہم اس طرح ان بیانات کو مستند تر بنایا گیا ہے۔

بالتخصیص سرسید (رح) اور علیگڑھ تحریک کے متعلق بعض جگہہ دو ایک فقروں میں ہی نہیں بلکہ ایک دو لفظوں میں ہی ایسا زہر بھر دیا ہے جسکو دفع کرنے کے لئے بہت کچھ آلت اختیار کرنا پڑی

بہرحال یہ تبصرہ ایک قومی و علمی خدمت ہے جو بغیر امید تحسین و خوف ملامت پیش کیا جاتا ہے۔

نیاز مند

۱۰ر نومبر ۱۹۴۶ء

محمد امین زبیری مارہروی

فہرست مضامین

تعنون

چوں کہ یہ تصنیف سرسیدؒ (رح) کے حضور میں
ایک نذر عقیدت، اور علیگڑھ تحریک کی خدمت ہے
اس لئے میں اسکو فرزندانِ علیگڑھ کے
کے نام پر معنون کرتا ہوں۔

محمد امین زبیری مارہروی

معذرت

افسوس ہی کہ چند ناگزیر اسباب سے کتاب میں غیر معمولی طور پر کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں، بعض سنین بھی غلط لکھی گئی ہیں، ان غلطیوں میں اکثر معمولی اور ناقابل اعتنا ہیں اور بعض اہم ہیں، اسلیئے غلطنامہ شامل کرنا ضروری متصور ہوا امید کہ ناظرین کرام اہم غلطیوں کی صحت فرمالیں گے۔

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۱	خانگی حادثہ	خانگی معاملات حادثہ	۴۰	۲۰	چند	چند روز
۶	۱۳	تلمیح	تلمیح	۴۴	۳	ترکان	ترکوں
۸	۱	کلیم مظفرنگر	اعیان مظفرنگر نے	۴۵	۳	عزیزی	عزیز ہے
۲۹	۱۹	مولانا	سرسید	۵۰	۱۲	حاصل اور	حاصل کی اور
۲۸	۲۰	رام کو	رامپور کو	۵۱	۴	بیان قابل	بیان ناقابل۔
۲۹	۱۲	سنہ	۱۸۹۶	۵۳	۲	دو	وہ
"	۱۳	سنہ	سنہ ۱۹۰۱	"	۸	خودینی	خود ہی
۳۳	۱۹	یار یاست	باشان ریاست	۵۴	۷	۲۳۶	۲۳۹
۳۷	۷	کردی	کردائی	"	۱۷	ازالہ لخفا	ازالۃ الخفا
۳۷	۱۲	برد	ہیرو	۵۷	۲	بیان تھا	بیان کیا تھا
۴۰	۳	۶۹	۲۹	"	۱۶-۱۷	وجہ سے کی	وجہ سے ان کی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۸	۳	سلف سے	سلف ہے	۱۰۸	۵	ہنوز	نبود
۶۱	۸	کے نواب	کے بعد نواب	۱۲۱	۱۶	مطابق	متعلق
״	۲۰	زین العابدین	زین الدین	۱۲۲	۴	بھی اور	یہی کیا اور
۶۲	۸	״	״	۱۲۴	۴	کہ یہاں	کہ جہاں
۶۲	۲۱	سلقیت	مطلقیت	۱۲۵	۲	رشمہ	شمتہ
۶۸	۵	متوقع	موقع	۱۲۹	۱۳	طبقے کے	طبقے میں
۶۹	۹	کیات	کلیات	۱۳۴	۳	سنہ ۱۸۹۰	سنہ ۱۸۹۸
״	۱۸	جس میں	جس جلسہ میں	۱۳۷	۱	سنگ بنیاد	ظاہری سنگ بنیاد
۷۰	۱۷	سنہ ۱۹۰۹	سنہ ۱۹۰۰	۱۴۰	۱	کہاں	کہاں تک
۷۱	۲	داستان سے	داستان ہے	۱۴۱	۷	کو ندوہ	کو ناظم ندوہ
״	۳	شاہد کار	شاہکار	۱۴۴	۸	جناب	مناب
۷۳	۳	کا جو خیال	کا ہے خیال	״	۱۰	اس نے	انہوں نے
۷۵	۱۸	الاسعدی	الاسدی	۱۴۷	۱۳	لوگوں پر	لوگوں کا
۷۷	۱	رسالے	علمائے	۱۴۸	۱۰	استعمال	اشتعال
״	۱۶	زمانے	زمانے میں	״	۱۲	مہینے میں	مہینے کا
״	۲۰	نہیں	نہیں ہوتا	۱۴۹	۱۲	ہدا فروختہ	برافروختہ
۷۹	۲۱	اخلاق	اخلان	۱۵۵	۷	دسائش	دسائس
۹۰	۱	ہزار دو ہزار	ہزار در ہزار	۱۵۶	۹	جن کے ارکان	جن ارکان
۱۰۰	۴	سنہ ۱۷۰۶	سنہ ۱۸۹۶	۱۶۱	۲	دریک	دردیک

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۶۲	۸	دم دانش	دم از دانش
۱۶۶	۱۳-۱۴	ابتدای مزاث وقت پر	ابتدای مراسلت
۱۶۹	۱۵	بچیدہ	بچینید
"	۱۲	راش	راہش
۱۷۱	۲۰	ہر وقت	بدولت
۱۷۲	۹	نیگری	بنگری
۱۷۳	۲۱	شاعر	متعہ
۱۷۵	۲	تعریف	تحریف
"	۵	از	ار
۱۷۶	۵	تاریخیں	تاریخی
۱۷۸	۱۱	سنہ ۱۸۸۵	سنہ ۱۸۹۵
"	۲۰	سلور	سطور
۱۷۹	۱۹	سارا	سارا سرمایہ
۱۸۱	۱۶	تعلیم	تعظیم
۱۸۳	۱۷	اسرار	تفسیر
۱۸۴	۲۰	شناس	سپاس
۱۸۷	۱۸	طول و عرض میں	طول و عرض ہند میں
۱۸۹	۲	سرگرداں	سرگراں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۳	۶	سرگرداں	سرگراں
۲۰۴	۹	( )	(۴۷)
۲۰۹	۱۸	کامل برد	کامل ہبرد
۲۱۶	۲۰	حزم	حرام
۲۲۵	۶	جربیانہ	مربیانہ
۲۲۶	۱	مولانا بھی	مولانا اڈیٹر
۲۲۷	۲	قومی دلی جذبات	قومی ملی جذبات
۲۲۸	۵	سنہ ۱۴۹۳	سنہ ۱۸۹۳ء
۲۳۱	۱۴	ارادہ شباب	اعادہ شباب
"	۱۵	صفت	صنف
۲۳۲	۲	تختے	شگفتہ
"	۵	مندس	مندمل
"	۶	اٹھاتے ہے	اٹھاتے رہے
"	۱۰	سنہ ۱۶۰۸	سنہ ۱۹۰۰
۲۳۳	۲۱	سنہ ۱۶۱۳	سنہ ۱۹۱۳
۲۳۴	۱۹	ارادہ کر چکے	امداد حاصل کی
۲۳۵	۱۹	شبے	شعبے
"	۲۱	سنہ ۱۹۰۵	سنہ ۱۹۰۵
۲۳۶	۱۱	سنہ	سنہ ۱۹۱۲
۲۳۷	۵	تباہ	بند
"	۶	اجتناب	احتساب
۲۳۸	۵	علمی وقون	علمی و قومی

ہندوستان کے علمی و تصنیفی اداروں میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ایک خاص امتیاز اور شہرت حاصل ہے، اس ادارے کے رفقا واقعات کی تحقیق اور روایات کی تنقید میں مشہور و ممتاز ہیں اور اسی تنقید و تحقیق نے اُن کی تصانیف اور تالیفات کو مقبول اور ایک معیار بنایا ہے۔

حال میں اس ادارے نے اپنے بانی شمس العلما مولانا محمد شبلی مرحوم و مغفور کے سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے "حیاتِ شبلی" کے نام سے نوسو صفحوں میں شائع کیے ہیں جس کے مصنف ڈاکٹر مولوی سید سلیمان ندوی (ناظم دارالمصنفین) ہیں اور جو صاحبِ سوانح (مولانا شبلی) کی تعلیم و تربیت کے بہترین نمونہ اور اُن کے جانشین بھی ہیں، اور بعض خصوصیات کے لحاظ سے ایک ربع صدی سے زیادہ درایت و تنقید کے ساتھ سیرت النبیؐ کی تالیف، انگلستان اور مصر و حجاز وغیرہ کے سفر، انگریزی دانی سے مغربی اسالیبِ تصنیف کی معلومات اور نئی نئی کتابوں کے مطالعے سے وہ نہ صرف معاصر علما میں بلکہ متقدمین کے مقابلے میں بھی امتیاز رکھتے ہیں اس لیے حیاتِ شبلی کو اُن کی قابلیتوں کا مرقع یا تماشا گاہ سمجھنا چاہیے۔

اس تصنیف کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جو شاید ہی کسی اور ایسی کتاب کو حاصل ہوئی ہو اور وہ مصنف کے الفاظ میں یہ ہے :-

"سب سے زیادہ مخدومی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمان خان شروانی

کا ممنون ہوں جنھوں نے مسودہ کے ان آٹھ سو صفحوں کو بڑی محنت سے حرف
بہ حرف پڑھا اور کہیں کہیں اپنے علم و مشاہدے کی بنا پر کچھ کچھ بڑھایا اور اس
طرح میرے بیانات پر اپنی ذاتی واقفیت کی مُہر سے گویا توثیق کی،
فللّٰہ الحمد" (ص۹ حیاتِ شبلی)

بلاشبہ نواب ممدوح کا علمی و ادبی مرتبہ بہت بلند ہے اور وہ پہلے شخص ہیں
جنھوں نے چالیس سال قبل مشہور سوانح عمری "حیاتِ جاوید" پر جو اب تک اردو میں
عدیم النظیر سوانح عمری تسلیم کی جاتی ہے ایک ایسا انتقادانہ تبصرہ کیا تھا جو اُن کے مفاخرِ علمی
میں سمجھا گیا، ایسے موثق کی توثیق کے ساتھ ظاہر ہے کہ کتاب کس معیار اور کس پایہ کی ہوگی۔

کتاب کی ابتدا ترتیبِ مواد اور معاونین کے ذکر سے ہوئی ہے۔ مواد کا زیادہ
حصہ مولانا کے مکاتیب سے حاصل کیا گیا ہے، معاونین میں یعنی جن لوگوں نے مواد بہم پہنچایا ہے راقم
تبصرہ بھی ہے۔ اس کے بعد دیباچہ و مقدمہ ہے۔ دیباچہ میں مولانا کی زندگی کا عطر کھینچا گیا
ہے۔ مقدمہ میں پورب اور لکھنؤ کے بعض علما کے اور (بطور گزیٹیر) اعظم گڑھ اور اس
کے اطراف کے حالات ہیں۔

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ مولانا کی ولادت، حسب نسب، تربیت،
تعلیم اور ابتدائی مشاغلِ زندگی کا بیان ہے پھر ۲۵ سال کی عمر میں علی گڑھ سے تعلق
پیدا ہوتا ہے اور زندگی سولہ سولہ سال کے دو ادوار پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ پہلا دور ۱۸۸۲ء
تا ۱۸۹۸ء ہے جو ایم اے او کالج کے علمی و تعلیمی کاموں اور قومی مشاغل، تصنیفی [illegible]
روم و شام و مصر کے سفر، شمس العلماء کے خطاب، ندوہ میں شمولیت، وظیفہ حیدرآباد وغیرہ
پر مشتمل ہے۔ دوسرا دور سرسید کی رحلت اور کالج سے قطع تعلق سے شروع ہوتا ہے
یعنی ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۴ء تک۔ اس دور میں [illegible] ملازمت
حیدرآباد، شغلِ تصنیف، تحریکِ ندوہ کی رہنمائی، حیدرآباد سے [illegible]

دارالعلوم ندوہ اور اس کی ترقی کی جد وجہد، خانگی حادثہ گزند پا، بمبئی کا قیام، ندوہ میں رفقا سے اختلاف، علیحدگی، اسٹرائک، مطالبۂ اصلاح، تعلیمی و مذہبی اور قومی خدمات و مصروفیات، تالیف سیرت النبی، تاسیس دارالمصنفین اور وفات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ آخر میں آل و اولاد اور اخلاق و عادات کا حصہ ہے۔

لیکن مصنف و مؤلف کے احترام اور ان کی علمی و ادبی عظمتوں کے باوجود بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اکثر واقعات کے بیان میں رنگ آمیزی و مبالغہ ہے کہیں واقعات مسخ کئے گئے ہیں اور کہیں چھپائے گئے ہیں اور پیدا کئے گئے ہیں بے سر و پا روایات اور ظنیات کی مثالیں بھی موجود ہیں رائی کو پہاڑ اور پہاڑ کو رائی بنایا گیا ہے بعض اقتباسات میں پوری دیانت بھی نہیں برتی گئی طویل اور شائع شدہ نظموں اور واقعات کی تکرار سے حجم بھی بڑھ گیا ہے۔

اس کوشش میں کہ اپنے ہیرو کو ہم عصر شاہیر سے بلند دکھایا جائے نہ صرف مبالغہ ہے بلکہ اسلوب بیان میں تحقیر بھی آ گیا ہے۔ پہلے دو یہ زندگی میں کسی خاص نظریے سے سرسید احمد خاں کی ایسی تنقیص و تحقیر ذکر حیات شبلی میں وہ ایک پست ترین شخصیت نظر آنے لگتی ہے۔

علی گڑھ تحریک ہی مورد مطاعن نہیں بلکہ بعض دیگر مشاہیر پر بھی .... تعریض ہے۔ غالباً اپنے مسلم کمالات، اور مشہور قابلیتوں کے زعم میں مصنف اور مؤلف کو یہ خیال بھی نہیں رہا کہ اس طرح کی لاف و گزاف علمی و تحقیقی زندگی پر ایک داغ رہے گی۔

اس حقیقت کا اظہار بھی نامناسب نہ ہوگا کہ ہماری قوم میں ایک اقل قلیل جماعت ایسی بھی ہے جو اپنے سیاسی رجحانات یا ذاتی مفادات کے باعث سرسید اور علی گڑھ تحریک کی مخالف رہی ہیں سے برابر کرتے رہنا اپنا وظیفۂ زندگی سمجھتی ہے۔

مؤلف حیات مولانا شیروانی نے اپنے مایۂ فخر تبصرے حیات جاوید میں لکھا

تھا کہ "اگر قوم کے یہ ذہن نشین نہ ہو کہ اس میں کچھ ایسی قلم ایسے بھی ہیں جو بخلاف معاد رکے قلم کے ظاہری امور کی تہ میں پہنچنے اور نا سرمادہ کے موقع پر نشتر بن کر اندر پیر جاتے ہیں اس وقت تک قوم سیدھی نہیں چل سکتی۔"

صاحب سوانح (مولانا شبلی) نے اس تبصرے کی داد دی تھی کہ "اگر ریویو بھی ایسے لکھے جائیں تو کتاب کا زہر بہت کچھ کم ہو سکتا ہے۔ (۶۱۰ حیات شبلی)

اسی تبصرے حیات جاوید میں موثق حیات شبلی کا یہ فقرہ بلیغ بھی ہے کہ "لائف تاریخ کا جزء ہے تاریخ کے کیا معنی ہیں واقعات کی حکایت اور جو کچھ واقعہ ہو اس کا بیان آنے والی نسلیں اس کمی کو پورا نہیں کر سکتیں جو وقائع نگاری میں معاصرین کے قلم سے رہ جائے، بیشک آیندہ نسلوں کو ٹھنڈے دل سے بے لگاؤ فیصلہ کرنے کا موقع بمقابلہ معاصرین زیادہ ملتا ہے لیکن جن واقعات کو ہم عصر بیان نہ کریں ان کو وہ کس طرح پیدا کر سکتے ہیں۔"

مگر یہ فقرہ اور اس کا مدعا ناتمام رہتا ہے اگر یہ اضافہ نہ کیا جائے کہ "اگر حکایت واقعات کسی خاص نظریے سے مبالغہ واخفا اور تحریف و تلمیح کے ساتھ کی جائے یا واقعات مفروضہ وتراشیدہ ہوں تو وہ ایسی گمراہی اور ضلالت ہے جس سے آیندہ نسلوں کا نجات پانا تقریباً ناممکن ہے اور وہ جو کچھ فیصلہ کرتی رہیں گی وہ ایک بڑی گمراہی وضلالت اور بناء الفاسد علی الفاسد ہو گی۔"

راقم نے یہ طویل تبصرہ بھی انھیں اصول و نظریات کی بنا پر لکھا ہے اور محض حکایت واقعات تک محدود رکھا ہے۔

آخر میں اس بات کو ظاہر کرنا بھی بے موقع نہ ہو گا کہ یہ تبصرہ کسی نفرت وعداوت یا رنجش و رقابت پر مبنی نہیں بلکہ محض درایت واقعات کے ساتھ ایک قومی فرض کی بجا آوری ہے اور اس شخص کے قلم کا ہے جس کو عرصہ ممتد سے صاحب سوانح اور

سوانح نگار کے ساتھ عقیدت و نیاز مندی کا تعلق ہے اور جو ہمیشہ ان کے مشن کا ہمدرد و حامی رہا ہے (اور سیرت النبی (صلعم) اور سیرت عائشہؓ اور مکاتیب شبلی میں نمایاں ہے اور اس وقت تک دار المصنفین کی رکنیت انتظامی کی نسبت رکھتا ہے۔

حیاتِ شبلی کا دیباچہ اور اُس پر ایک نظر

مصنف نے دیباچہ حیات کے چالیس صفحات میں بڑی بلند آہنگی کے ساتھ مولانا شبلی کے کارناموں کی اہمیت و اوّلیت بیان کی ہے مگر ان میں مبالغہ ہے، واقعات بے ربط ہیں دوسروں کی فضیلت تقدم اور ان کے کارناموں کو کہیں نظر انداز کیا گیا ہے اور کہیں ان کی حقارت ہے اب ہم ذیل میں سلسلہ وار اس قسم کی چند مثالیں اور ان پر تبصرہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) "انگریزوں کے برسرِ عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا، مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئین پر حملے شروع کر دیے، دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پاکر ان پر حملے کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم و فنون و تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی"

اس کے بعد مولانا رحمت اللہ کیرانوی ڈاکٹر وزیر خاں آگرہ مولانا رحم علی منگلوری مولانا محمد قاسم مولانا عنایت رسول چریاکوٹی اور سید محمد علی کی خدمات کا (عیسائیوں کے مقابلے میں) اور آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلے میں مولانا محمد قاسم کا ذکر کرکے آخری حملے کے مدافعین کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف نے جو شبہات پیدا کیے اُن کا اصلی جواب تو وہ علما دے سکتے تھے جو ہمارے

کریم متکلمین کی طرح جو قدیم فلسفے میں ماہر تھے اس زمانہ کے نئے علوم اور نئی
تحقیقات سے واقف ہوتے مگر بہرحال ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ
اگر پورا نہ مل سکے تو ادھورا ہی سہی کے اصول کے مطابق انھیں لوگوں میں
سے جو گو نیم عالم تھے لیکن انگریزوں سے دن رات ملتے تھے اور ان کے
علوم و خیالات سے کچھ کچھ واقف تھے مثلاً سرسید مولوی چراغ علی اور مولوی
کرامت علی جونپوری وغیرہ چند ایسے اشخاص کھڑے ہوئے جنھوں نے اپنے
اپنے خیال کے مطابق اس فرض کو پورا کرنا چاہا اور ان سے بہتوں کو ایک
معنی کر فائدہ بھی پہنچا لیکن چونکہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے اور نہ علمائے حق
کی صحبتوں سے مستفید تھے انھوں نے اپنے کاموں میں جگہ جگہ غلطیاں کیں اور
ایسی غلط تاویلوں کے شکار ہوئے جو حقیقت سے بمراحل دور تھیں ....
اس سے آگے بڑھ کر ایک اور دور آیا جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں
کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و
تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات
بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے اس دور میں
اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصے میں آئی وہ ہمارے ان اوراق
کا ہیرو ہے" (۱۵-۱۶-۱۷ دیباچہ حیات)

(۳) "یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفے سے بہت کچھ ہٹ کر
تاریخ کی طرف منتقل ہو گیا تھا اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی
جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی" ....

"ہندوستان میں دشمنوں کا یہ حملہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا
تھا، ہندوستان میں ان حملہ آوروں کے سب سے پہلے علم بردار ڈاکٹر اسپرنگر تھے

" جو اس زمانے میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ کار بھی تھے ان کے بعد صوبہ یو۔ پی کے سابق گورنر سر ولیم میور صاحب بھی آئے اور لوگ بھی اسی طرح آتے رہے .... ایسے ہوشمند حریفوں کے مقابلے کے لیے ساری دنیائے اسلام میں جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنہوں نے انھیں کے طریقوں سے انھیں کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا .... اس سلسلے کا آغاز مولانا نے اپنی گزشتہ تعلیم سے کیا (۲۵ دیباچہ) ......

" مخالفین اسلام کی طرف سے اس پر بڑا غلغلہ بلند تھا کہ اسلامی ملکوں میں غیر مسلم رعایا کو عام حقوق زندگی بھی حاصل نہیں اتفاق سے اسی زمانے میں آرمنیا کا واقعہ پیش آیا یعنی ترکی نے آرمنیا کے عیسائیوں کی بغاوت کو جب بزور ختم کر دیا تو یورپ کے اصحاب قلم نے اسلامی ملکوں میں غیر مسلمانوں پر مظالم کے دردناک مرثیے چھاپے اور اس کا ذمہ دار اسلام کو قرار دیا اس موقع پر مولانا نے آرمنیا کے مفروضہ مظالم کے اسباب الگ لکھے اور حقوق الذمیین لکھکر یہ بتا دیا کہ اسلام نے اپنی غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو جو حقوق دیے ہیں وہ تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہیں بلکہ اس کی بلندی تک یورپ کی سلطنتوں کے عدل کا پرپرواز بھی نہیں پہنچا ہے اس مضمون نے مخالفوں کی آنکھیں بھی کھول دیں اور اس وقت سے برابر عیسائی اہل قلم اس کے جواب میں مصروف ہیں اور سب سے آخری کتاب اس کے جواب میں پروفیسر پادری اے ایس ٹریٹن سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی کی کتاب غیر مسلم رعایا مسلمان خلفا کے زیر حکومت ۔ سنہ ۱۹۳۰ء ہے "

(صفحہ ۲۹ دیباچہ حیات)

(۳) "تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو پرواز یورپ نے قائم کیا ہے اور یورپ کے مستشرقین جس وسعتِ نظر جستجو اور نادر کتابوں کے مطالعہ اور نامعلوم گوشوں سے اہم نتائج کی تلاش کرتے ہیں مولانا نے اپنی اس تصنیف اور دوسری تصانیف اور اپنے تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا جن کی مدح وستائش کا اعتراف خود یورپ کے مستشرقین نے علی الاعلان کیا اور اس طرح اسلام کی سربلندی کا جھنڈا جس کو وہ جھکا دینا چاہتے تھے مولانا کے دستِ بازو نے اس کو علیٰ حالہٖ بلند رکھا اور اس کے لیے وہ ساری دنیائے اسلام کے شکریے کے مستحق ہیں۔"

"عیسائی مدت سے کوشاں ہیں کہ وہ قرآن پاک کو محرف ثابت کرسکیں اور اس کے لیے وہ طرح طرح کی تدبیں اور دسیسہ کاری کیا کرتے ہیں جس سال انھوں نے وفات پائی ہے اسی سال (اپریل ۱۹۱۶ء میں) لندن سے ایک غلغلہ بلند ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر منگانا نے لائبریری کے ایک گوشے میں قرآن پاک کا ایک ایسا قلمی پرانا نسخہ پایا ہے جو موجودہ قرآن سے بہت مختلف ہے ڈاکٹر منگانا نے اس کی پوری تشہیر کی چنانچہ ۲۵ر اپریل ۱۹۱۶ء کو ٹائمز آف لندن نے اس پر ایک آرٹیکل لکھا اور بڑے دعوے سے اس کا اعلان کیا اس اعلان کے مقابلے کے لیے بھی مولانا ہی کا قلم میدان میں آیا اور متعدد مضامین میں اس کا جواب دیا اور اس تحقیق کا سارا تار پود بکھیر دیا۔" (صفحہ ۳۳ دیباچہ)

(۴) "علما میں وہ پہلے شخص تھے جس نے وقت کی سیاسی باتوں میں دل چسپی لی کانگریس کی حمایت کی ہندو مسلم سیاسی مصالحت پر مضامین لکھے مسلم لیگ کے زاویہ نظر بدلنے کے لئے متعدد مضامین اور بیسیوں نظمیں لکھیں احرارِ اسلام

کی رہنمائی کی اور ان کی بے راہ روی پر اُن کو ٹوکتے بھی رہے ہندستان میں عالمگیر اتحاد کے وہ داعیِ اوّل تھے اوقافِ اسلامی وقف علی الاولاد تعطیل جمعہ اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومتِ وقت کے سامنے پیش کر کے تحریک کو کامیابی کی حد تک پہنچایا اور عام مسلمانوں پر ان کا یہ بڑا احسان ہے' اس روشنی میں دیکھیے کہ اب آج کل جو حضرات علما میں سیاسی سرگرمی ہے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا جوش ہے ملکی مطالبات کے ساتھ ہم آہنگی ہے اور ہندو مسلم اختلافات کو دور کرنے کے لیے جو دوربینی ہے اور مختلف سیاسی گروہوں میں منقسم ہو کر بھی بہرحال سیاسی مسائل سے وابستگی ہے وہ کس کی پکار کا نتیجہ ہے " (۴۰ دیباچہ)

ان چار مثالوں کو واقعات کی روشنی میں دیکھیے :-

(۱) مصنف نے عیسائی مشنریوں اور آریوں کے حملوں کی مدافعت کے جواب میں جن بزرگوں کا نام لیا ہے بلا شبہ ان کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل بیان ہے کہ بعض عربی داں اور قابل مسلمان بھی مشنریوں کے دام میں آ گئے تھے اور انھوں نے جو تصنیفات کیں اُن کو مشن نے بہ کثرت شائع کیا۔ ان مرتدین میں ایک پادری عماد الدین بھی تھے جنھوں نے ہدایت المسلمین اور تاریخ محمدی دو نہایت زہریلی کتابیں لکھی تھیں اُن کے جواب کے لیے سب سے پہلے مولانا حالی میدان میں آئے اور پہلی کتاب کے رد میں " تریاقِ مسموم " کے نام سے ایک کتاب لکھی اور دوسری کی تردید میں ایک " تبصرہ " بہ صورت رسالہ شائع کیا اور آں حضرت صلعم کے متعلق جو کچھ پادریوں نے لکھا تھا اس کا فلسفی اور غیر متعصب یوروپین فضلا کی آرا سے مقابلہ کیا اس طرح انھوں نے ایک جدید اسلوبِ مباحثہ کی راہ نکالی اور یہ اوّلیت اُن کے حصے میں آئی۔ اسی کتاب کا جواب مولوی چراغ علی (نواب اعظم یار جنگ) نے بھی لکھا جس کا نام " تعلیقات " ہے۔ اس

میں دکھایا ہے کہ مصنف تاریخ تمدن کے مانند کتنے غلط اور پوچ ہیں ساتھ ہی احادیث کی صحت و غیر صحت پر بھی بحث ہے یوروپین فاضلوں کی رائیں بھی درج ہیں مسیح اور اناجیل اربعہ پر بھی رد و قدح ہے اور تاریخی روشنی میں دکھایا ہے کہ مسیح کی سوانح عمری کس قدر غیر معتبر اور انجیلوں کی کیا وقعت ہے۔ یہ کتاب ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی اس کے علاوہ انھوں نے اس زمانے کے اخبارات منشور محمدی اور مخبر صادق میں اس قسم کے اکثر مضامین لکھے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا شبلی ثانوی تعلیم کے مدارج طے کر رہے تھے۔

(۲) یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے اسرار کے انکشاف نے جو شبہات پیدا کئے اس کے سلسلے میں مصنف نے سر سید اور مولوی چراغ علی کے کام کو ادھورا اور ان دونوں کو نیم عالم کہا ہے اور فوراً ہی بعد ایک دور دور یورپ کے مستشرقین کے تعاون کا پیدا کر دیا ہے لیکن مصنف کسی توجیہ میں ان ادوار کو آگے پیچھے کر گئے پہلا دور مستشرقین کا ہے سائنس کا دور اس کے بعد آیا ہے بہر حال دور مستشرقین میں ہی سر سید اور مولوی چراغ علی کا بڑا کام ہے جن کو نیم عالم بتایا گیا ہے لیکن مصنف حیات شبلی اس دور میں اسلام کی سعادت خدمت اپنے ہیرو کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ اس موقع پر ہم سلسلہ وار تبصرہ کرنے سے قبل یہ امر ضروری تصور کرتے ہیں کہ حیات شبلی سے ہی مولانا کی تعلیمی کیفیت بیان کر دی جائے تاکہ ان کے علوم معقولات و منقولات کی تحصیل و درس کا اندازہ اور عالم و نیم عالم کے امتیاز کا بھی فیصلہ ہو سکے۔

مولانا نے مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ میں عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں چند روز مدرسہ حنفیہ جونپور میں پڑھا "لیکن در اصل مولانا کی تعلیم کا حقیقی سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ مولانا فاروق چریاکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے" (۴۷) مولانا کا بیان ہے کہ "میں نے معقولات کی تمام کتابیں .... انھیں سے پڑھیں اور میری تمام تر کائنات انھیں کے افادات ہیں فارسی کا مذاق بھی انھیں کا فیض ہے (۴۷)" مولانا نے

حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کی
یہ تعلیم غالباً سال بھر جاری رہی (۸۰) وہ دیوبند گئے اور ایک مہینے کے قریب سے
(۸۰) مولانا فیض الحسن سے درسِ ادبیات لیا (۸۲) مولانا کو سادہ عربی نگاری کا
شوق جاحظ کی کتابوں سے پیدا ہوا تھا جو انھیں علی گڑھ آنے کے بعد ملیں (۸۳) مولانا
فیض الحسن سے مدتِ استفادہ کم رہی (۸۴) "مولانا نے دوسرے تمام علوم سے
فراغت پاکر حدیث کی طرف توجہ فرمائی (۸۸) "مولانا احمد علی صاحب کا آستانۂ علم
مولانا کی آخری درس گاہ تھی اس وقت سنن ترمذی کا درس ہو رہا تھا کہ مولانا کے والد
اور خاندان کے بعض اعزا نے حج کا قصد کیا.... اس وقت مولانا کی عمر ۱۹ برس کی
تھی اور کل مدتِ تحصیل چودہ برس ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء سے تعلیم شروع اور
۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں تمام ہوئی بمبئی سے حاجیوں کے اس مقدس قافلے کے ساتھ مولانا بھی
حجاز کو روانہ ہو گئے (۹۱) مصنف نے رام پور اور لاہور کے تعلیمی سفر کے سنین
۱۲۹۱ھ و ۱۲۹۲ھ لکھے ہیں اس طرح فقہ و حدیث اور ادب کی تعلیمی مدت ڈھائی
سال ہوتی ہے حدیث کی بھی نا تمام تعلیم تھی تفسیر و عقائد کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں حج سے
واپسی کے بعد تکمیل نہیں کی بلکہ دیگر مشاغل اختیار کیے غرض اس روداد میں علم کی کسی
شاخ کی بھی تکمیل نظر نہیں آتی بہ این الفاظ مولانا کو نیم عالم ہی کہے جا سکتے ہیں اور
یہ حقیقت بھی ہے کہ ان کے معاصر علما مثلاً مولانا لطف اللہ، مولانا محمود الحسن، مولانا
محمد ابراہیم آروی، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا عبدالباری
فرنگی محلی، مولانا شاہ سلیمان پھلواری (رحمۃ اللہ علیہم) کے پہلو بہ پہلو مولانا شبلی کو
کبھی جگہ نہ مل سکی، مگر جو خدمات کہ مولانا شبلی نے کیں اور اپنی نا تمام تعلیم کے
باوجود اپنے ذوقِ علمی، انہماک، ذہانت اور تدقیق کی بدولت ملک و قوم کو جو فوائد
پہنچائے وہ تمام علمائے تذکرہ کے مجموعی کام سے زیادہ وزنی ہیں۔

مدبرین کی رائیں بھی پیش کی ہیں جو ترکی معاملات سے خاص واقفیت رکھتے تھے یا ان کو سفیر
ہونے کی حیثیت سے ذاتی معلومات تھیں اور کتاب بھی سلطان عبدالحمید خاں کے نام
معنون کی حالانکہ وہ اس وقت ایک ریاست میں ملازم تھے اور اعلیٰ خدمت پر
مامور تھے اور شیعہ خاندان کے رکن تھے۔ مولوی چراغ علی کی دوسری معرکہ کی تصنیف
تحقیق الجہاد ہے یہ اس اعتراض کا جواب ہے کہ "اسلام بزور شمشیر دنیا میں پھیلایا گیا"
جواب کے سلسلے میں ڈاکٹر اسپرنگر سر ولیم میور اور دیگر مصنفین کے اُن بیانات پر جو اس
مسئلے کے متعلق ہیں تنقید ہے۔

تیسری کتاب محمد دی ٹرو پرافٹ (محمد سچے رسول اللہ ہیں) ہے۔

اسی طرح اور متعدد کتب و رسائل ہیں جن کا سلسلہ ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۵ء تک
(جس سال کہ مولوی چراغ علی کا انتقال ہوا) جاری رہا۔

مولوی سید امیر علی کی خدمات کا زمانہ بھی تقریباً انھیں سالوں سے شروع ہوتا ہے
ان کی پہلی کتاب "کریٹیکل اگزامینیشن آف دی لائف اینڈ ٹیچنگس آف محمد" ہے جس
میں آنحضرت صلعم کی زندگی مبارک اور تعلیمات کو تحقیق کے ساتھ دکھایا ہے" دوسری
کتاب اسپرٹ آف اسلام" ہے جو مشہور روزگار ہے تیسری "اسلام" ہے اور چوتھی
"اے شارٹ ہسٹری آف دی سارا سینس" ہے یہ سب انگلستان میں لکھیں اور شائع کیں اور
مقبول ہوئیں اب غور کیجیے کہ یہ اکابر سابقین الاولون ہیں یا مولانا شبلی اور اس دور
میں دشمنان اسلام کی مدافعت کی سعادت ان بزرگوں کے حصے میں آئی یا مولانا شبلی
کے؟ آیا ان مصنفین کی تصانیف مستشرقین کا جواب ہیں یا مولانا کے چند مقالات و مضامین
جن کا اوپر ذکر ہوا اُردو والوں [illegible] رہا۔ مصنف نے مولانا کے جواب دینے کا
سلسلہ نوشتہ تعلیم [illegible] قائم کیا ہے مگر اس کو لکھتے وقت اس طرف مولانا کا التفات بھی
بھی نہ تھا، واقعہ اتنا ہے کہ سرسید نے ۱۸۸۶ء کے اجلاس کانفرنس کے لیے

چند مضامین لکھوائے تھے ان میں تین مضمون مسلمانوں کی گزشتہ موجودہ اور آیندہ تعلیم پر تھے، مولانا نے گزشتہ تعلیم پر لکھنا پسند کیا وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اشتہار میں شائع کیا گیا ہو کہ شبلی مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ایک وسیع مضمون پڑھے گا شاید میں جی لگا کر لکھوں اور گراں مایہ لکھوں"۔ (مکاتیب جلد اوّل صفحہ ۸۲) چنانچہ یہ مضمون کانفرنس میں جستہ جستہ سنایا گیا (روئداد ۱۸۸۷ء) اور پھر بطور رسالہ کانفرنس نے شائع کیا، کوئی شک نہیں کہ دور اوّل میں مولانا نے نہایت اہم اور محققانہ مقالات لکھے ہیں ان میں متعدد ایسے ہیں کہ ان کے موضوعات پر کچھ مباحث موجود تھے جزیہ اور حقوق الذمیین پر ۱۸۸۳ء میں مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب (اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام) میں بحث کی ہو کتب خانہ اسکندریہ پر ایک انگریز نے یونانی و رومی تاریخوں سے استناد کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر کے وقت میں جلا تھا (خطوط سرسید صفحہ ۳۴) مولانا کا یہ شوق تصنیف علی گڑھ میں پیدا ہوا جہاں اس قسم کا بڑا مواد اور سرسید کا نادر کتب خانہ موجود تھا چنانچہ ایک خط میں لکھا تھا کہ "سید صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دے دی ہو اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہو سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں ہم کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپے کے صرف سے کرایا ہو میرے مطالعے میں ہے"۔ (مکاتیب حصۂ اول صفحہ ۵۷ ۱۸۸۳ء) مولانا کے مذہبی مضامین میں حقوق الذمیین سب سے اہم اور بڑا مضمون ہے جو علی گڑھ میگزین کی دو اشاعتوں اپریل و مئی ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا واقعہ یہ تھا کہ دو ڈھائی سال قبل آرمینیا کا جھگڑا برپا ہو چکا تھا ترکوں پر الزام لگائے گئے تھے اور عیسائی دنیا میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف متعصبانہ جذبات بھڑکائے جا رہے تھے اور

پادریوں کا پروپگنڈا زور و شور سے جاری تھا اس سلسلے میں انگلستان کے متعصب پیشہ ریورنڈ ملکم مکال نے ۲۰ جنوری ۱۸۹۵ء کے ٹائمز میں ایک آرٹیکل میں یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ مذہب اسلام عیسائیوں کے حق میں سخت ظالمانہ قانون ہے اس کا ترجمہ دلی کے مشنریوں نے نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ مولانا کا یہ مضمون ڈیڑھ سال بعد اس ترجمہ مضمون کا جواب ہے جس کا عربی یا انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوا اور وہ رسائل تک محدود رہا، مصنف نے اس امر کا بھی کوئی حوالہ نہیں دیا کہ ۱۹۳۰ء سے پہلے یعنی ۳۴ سال میں کہاں کہاں کے عیسائی اہل قلم جواب میں مصروف رہے اور کون سا جواب لکھا گیا پادری ایس ایس ٹرٹین کی کتاب میں نہ کہیں شبلی کا نام ہے نہ ان کے مضمون کا حوالہ نہ کوئی دھندلا نشان ہے کہ وہ حقوق الذمیین کے جواب میں لکھی گئی بلکہ یہ کتاب عہد شام کی تنقید ہے اور اس ضمن میں یہ بحث بھی ہے۔ مستشرقین یورپ کی مدح و ستائش کے ادعا میں کوئی اقتباس یا حوالہ نہیں۔

سرسید اور سید امیر علی کے متعلق خود مولانا کا ایک بیان ملاحظہ کرنا چاہیے:۔

"ایک عظیم الشان لٹریچر ہے جو دوسری زبانوں میں پیدا ہو گیا ہے اسلام کو تباہ کرنے والا برباد کرنے والا کیا آپ کو اس طرح مٹا سکتے ہیں .... حضرات اس وقت تک جو کچھ اسلام کی خدمت کی ہے غیر قوموں کے سامنے وہ ہمارے علما نے نہیں کی ہم نے نہیں کی ہے مولویوں نے نہیں کی ہم دستار بندوں نے نہیں کی بلکہ ان لوگوں نے کی ہے جو ڈاڑھی منڈاتے ہیں امیر علی نے کی ہے جو بالکل داڑھی منڈاتا ہے جس کو میں صورتاً عیسائی سمجھتا ہوں اس نے ایک کتاب اسپرٹ آف اسلام لکھی ہے اس کتاب کو پڑھ کر عیسائیوں اور ایرانیوں[1] نے اسلام کی وقعت اور تعریف کی۔

---

[1] اصل میں لفظ "یہودیوں" معلوم ہوتا ہے سہو کتابت سے ایرانیوں ہو گیا۔

سرسید احمد خاں نے خطبات احمدیہ جو انھوں نے انگلستان میں رہ کر لکھی ہو اس میں انھوں نے خاص خدمت انجام دی ہو اس کا اثر جو کچھ انگریزوں میں پھیلا وہ کیا اثر ہو آپ خود اس کو سمجھ سکتے ہیں، یہ کس قدر افسوس کی بات ہو کہ وہ فرائض اور خدمات جو ہمارے ہیں ان کا ساغر ہم سے چھین کر یہ رند قدح خوار پی لیں" (۱۰۰ تا ۱۱۰ رپورٹ ندوۃ العلما)

اب ڈاکٹر منگانا کے مقابلے میں مولانا کی یکتائی و متعدد جوابی مضامین اور تار و پود تحقیق کے بکھیرنے کی نسبت بھی واقعہ ملاحظہ کیا جائے۔

یہ مضمون ۲۵ راپریل ۱۹۱۴ء کو لندن میں شائع ہوا مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد ہندوستان میں اس کی شہرت و اشاعت ہوئی۔ اس پر مولانا نے "یورپ اور قرآن کے علدیم الصحت ہونے کا دعویٰ" ایک عنوان قرار دے کر مختصر مضمون لکھا جو مقالات شبلی جلد اول کے صفحات ۶۶ تا ۷۴ میں منقول ہو۔

مضمون کی تمہید ہی میں مولانا نے لکھا ہو کہ "مذکورالصدر آرٹیکل پر ابھی کچھ لکھنا قبل از وقت ہو اس لیے کہ اس آرٹیکل میں ظاہر کیا گیا ہو کہ کیمبرج یونی ورسٹی پریس چند روز میں یہ مسودات شائع کر دے گا اس لیے جب تک وہ مسودات شائع نہ ہو جائیں تفصیلی طور پر اس کے متعلق بحث نہیں ہو سکتی شائع ہونے کے بعد آسانی سے یہ فیصلہ ہو سکے گا کہ وہ مسودات کس زمانے کے ہیں اور ان کی صحت پر کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہو اعتبار کے کیا وجوہ ہیں قدامت کی کیا کیا شہادتیں ہیں کس قسم کے اختلافات ہیں، ان مسودات پر عیسائیوں کا دست تصرف کہاں تک پہنچا ہو۔" (۶۶-۶۷ مقالات)

ان تنقیحات کو قائم کرنے کے بعد ایک مختصر بحث اس آرٹیکل پر ہو اور پھر اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں "جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہو کہ اوراق مذکورہ کا ماخذ حضرت زید بن ثابتؓ کے زمانے سے پہلے کا ہو وہ اس کے ثبوت میں کیا دلائل پیش کر سکتا ہو؟

کیا ان اوراق پر کتابت کی تاریخ لکھی ہے؟ کیا کاغذ کی کہنگی یا خط کی شان سے کتابت کا ٹھیک زمانہ متعین ہو سکتا ہے؟ کیا ڈاکٹر منگانا یا اور کوئی صاحب ان اصول شہادت کے معیار سے اپنے دعوے کو ثابت کرنے پر تیار ہیں؟ ان تمام امور کو معلوم کرنے کے لیے ہمیں اوراق مذکورہ کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہیے" (۶۹-۷۰ مقالات)

اس کے بعد مولانا نے قرآن مجید کی تدوین کی کیفیت اور "تحریر و کتابت" پر پانچ صفحات میں تاریخی روشنی ڈال کر اس فقرہ پر ختم کیا ہے کہ ہم نے اس مضمون کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے جب کیمبرج پریس اپنے کاغذات شائع کرے گا اس وقت ہم اس کو بتا دیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا" (۷۴ مقالات)

کیا مولانا نے کاغذات شائع ہونے کے بعد کوئی اور مضمون لکھا جو درحقیقت مکمل جواب ہوتا مگر نومبر میں مولانا کا تو انتقال ہو گیا اور کاغذات بعد کو شائع ہوئے ڈاکٹر منگانا کے جواب میں سب سے زیادہ قابل قدر کام خواجہ کمال الدین (لاہور) اڈیٹر اسلامک ریویو و امام مسجد ووکنگ (انگلستان) کا ہے جنھوں نے اس کے لیے مصر جا کر اثری مسالہ بھی جمع کیا اور تاریخی مواد کے ساتھ منظر پر لائے اس طرح منگانا کی تحقیق کا تار و پود بکھرا۔

بلا شبہ مولانا شبلی کی متعدد خدمات بہت قابل قدر ہیں خصوصاً وقف علی الاولاد تو بڑا ہی کارنامہ ہے مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مسٹر محمد علی جناح کی مساعی مشکور بھی شامل ہیں اور ان کا اعتراف مولانا مرحوم نے اپنی تحریر اور رپورٹ ۱۹۱۲ء میں کیا ہے مگر مصنف حیات شبلی مسٹر مظہر الحق بار ایٹ لا کو یہ سارا حصہ فیاضانہ طور پر عطا کر دیتے ہیں۔

مولانا مرحوم کا عالمانہ حیثیت سے سیاسیات میں حصہ لینا اور زمانہ حاضرہ میں علما کی سیاسی سرگرمیوں کا سہرا اُن کے سر باندھنا مبالغہ بھی ہے اور خلاف واقعہ بھی،

ان کو طبقۂ علما میں کوئی عالمانہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی موثق حیات شبلی بھی ایک مؤرخ سے زیادہ نہیں مانتے کسی معاصر عالم نے ان کو مفسر فقیہہ یا محدث تسلیم نہیں کیا نہ کبھی ان کی قیادت مانی، ایک مضمون اور چند نظموں سے کوئی شخص سیاسی لیڈر نہیں بن سکتا۔

جنگ عظیم کے تتمے میں جب خلافت کو موضوع سیاست بنا یا گیا اور سیاسیین کو مذہبی رنگ آمیزی و تائید کی ضرورت ہوئی تو ۱۹۱۸ء میں بااثر سیاسی اصحاب نے جن میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نہایت نمایاں تھے ان علما کو گوشوں اور حجروں سے باہر لاکر میدان سیاست میں کھڑا کر دیا[۵] یہاں ان کی شرکت کے نتائج سے بحث نہیں صرف یہ دکھانا ہے کہ مصنف حیات شبلی نے مولانا کی دستار سیاست پر جو طرّہ لگایا ہے وہ ان کا حق نہیں۔

متذکرہ صدر چند مثالوں سے مبالغہ و رنگ آمیزی اور صاحب سوانح کی عظمت کے لیے واقعات کی تخلیق اور دوسروں کی تحقیر کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے لیکن اب ہم متعدد حالات و واقعات کا جائزہ لیں گے جن کو مصنف سوانح نے بہ تفصیل لکھا ہے اور جو ہمارے علم و مطالعہ اور تحقیق کے دائرے میں آتے ہیں۔

تبصرہ و تنقید کتاب

پہلا دورِ زندگی

(أ) کتاب میں علی گڑھ کا سفر، سر سید سے ملاقات، ان کی مدح میں عربی قصیدہ، کالج کا تعلق، وغیرہ وغیرہ، ان متعدد عنوانات سے مولانا کا پہلا دورِ زندگی

---

[۵] رپورٹ آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۱۸ء۔

شروع ہوتا ہے جب کہ ان کے والد شیخ حبیب اللہ ۱۸۷۱ء میں انھیں ہمراہ لے کر اپنے دوسرے فرزند مہدی حسن سے ملنے کو آئے اس تمہید کو بیان کرکے مصنف حیات لکھتے ہیں کہ :۔

منادی غیب نے آواز دی "آمد آں یارے کہ ما می خواستیم" مولانا گئے تو خالی ہاتھ نہیں گئے سرسیّد کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ لے کر ساتھ گئے سرسید نے اس قصیدے کو دیکھا تو اس کے تیور زبان طرزِ ادا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور قصیدے کو اپنے علی گڑھ گزٹ (مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء) میں چھپوا دیا، (۱۱۸) ..... قصیدے میں سرسیّد کی صرف دو باتوں کی تعریف ہے ایک اُن کے حسب و نسب و سیادت کی اور دوسرے اُن کے قومی کاموں کی ان دونوں باتوں کے بیان میں کسی قسم کا مداحانہ غلو اور پیشہ ور شاعروں کی طرح گداگرانہ مذلت و ابتذال نہیں اور یہی چیز شاعر کی بلند خیالی علو نفس اور ذہنی برتری کو ظاہر کرتی ہے (۱۲۰)

بلاشبہ قصیدے میں وہ باتیں ہیں، جو مصنف نے بیان کی ہیں لیکن اس مدح اور عربی نظم میں ایک مقصود ذہنی تھا۔ مولانا کے اوراق حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک وکالت، ملازمت اور تجارت میں ناکام یا ناموزوں ثابت ہوئے تھے اور ان کے والد چاہتے تھے اور ان کے خانگی حالات کا اقتضا بھی تھا کہ مولانا حصولِ معاش کے ایسے مشغلے میں مصروف ہوں جو طبیعت کے مناسب بھی ہو علی گڑھ میں ہی اس کا موقع تھا، اس زمانے میں علی گڑھ تحریک کے بانی و حامی سب ہی واں تھے اور عربی ادب سے ذوق رکھتے تھے چنانچہ ۱۸۷۵ء میں افتتاح مدرسۃ العلوم کے وقت مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد ہاشم نے عربی نظم و نثر میں مبارک باد لکھی تھی ۱۸۷۵ء میں سر ولیم میور کو ۱۸۷۶ء میں رئیس سفارت ترکی کو اور ۱۸۸۲ء میں مسٹر

بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کو عربی میں ایڈریس پیش کیے گئے تھے ۱۸۸۳ء میں اعیان مظفر نگر نے خود سرسید کو عربی میں ایڈریس دیا تھا، مولانا شبلی نے بھی اپنی قابلیت کے اظہار کا ذریعہ عربی میں قصیدے ہی کو بنایا گداگرانہ مذلت وابتذال اور علو نفس کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، سرسید کو انسانی جوہر پرکھنے کا ملکہ کامل تھا انھوں نے ۲۴ سالہ نوجوان شاعر میں کچھ جوہر دیکھے اور اگرچہ بقول مصنف حیات، قصیدے میں بعض فن کی کمزوریاں تھیں (۱۲۰) مگر نہایت حوصلہ افزا تمہید سے کالج کے اخبار میں شائع کیا گیا سرسید کو اپنی تعریف کی اشاعت مقصود نہ تھی بلکہ مولانا کو حلقۂ علم و ادب میں روشناس کرانا تھا، پھر اس قصیدے کے سال سوا سال بعد ہی مولانا فیض الحسن کی سفارش پر مولانا چالیس روپیہ ماہانہ پر اسسٹنٹ عربک پروفیسر مقرر ہوگئے گویا اس قصیدے کا صلہ مل گیا۔

مصنف نے ان واقعات کے سلسلے میں مولانا شروانی موثق حیات کے مضمون مندرجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء کا یہ اقتباس حاشیہ میں درج کیا ہے:۔

"نوجوانی میں علی گڑھ تشریف لائے خان بہادر محمد کریم اس زمانے میں یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے اُن کے توسل سے مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم سے ملے مولوی صاحب ممدوح کو خداوند تعالیٰ نے جوہر شناسی کا ملکہ بخشا تھا کتنے آدمی ان کی جوہر شناسی کی بدولت کیا سے کیا ہوگئے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے ان کو کالج کی پروفیسری کے لیے انتخاب کر کے سرسید احمد خاں کے سامنے پیش کیا" (۱۲۲ حیات)

لیکن اس مضمون کا یہ اہم حصہ مصنف نے عمداً نظر انداز کیا

"یہ راستہ تھا مولانا شبلی کے "علامہ شبلی" بننے کا پھر سرسید کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا بنگلہ لے کر آرہے سرسید مرحوم کو خداوند تعالیٰ نے ایسا دماغ

عطا فرمایا تھا جو صحیح اصول کا اخذ کرنے والا تھا ذوق علم اُن کے رگ و پے میں
ساری تھا اُن کی مجلس میں علمی چرچے رہتے تھے مختلف مسائل پر جرح و قدح
ہوتی تھی جدید و قدیم اصول باہم ٹکراتے تھے۔"
مصنف نے گویا اس راستے کو قصداً بھلایا جس سے اعظم گڑھ کے مولوی شبلی ہندوستان
کے علامہ شبلی بنے، پھر مصنف نے "سرسید سے میل جول کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے کہ
"جیسے جیسے یہ ایک دوسرے سے ملتے گئے ایک دوسرے کی قدر پہچاننے
لگے مولانا کو سرسید کے کتب خانے کی محبت تھی اور سرسید کو ایک ایسے شخص
کی ضرورت تھی جو عقلی مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کو مدد دے سکے۔" (۱۲۶)
اسی عنوان میں مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کے ایک مضمون کا اقتباس ہے کہ
"سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مؤرخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے
اور تحقیق و تدقیق کے لیے انھیں اکثر حدیث و فقہ اور تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعے
کی ضرورت پڑتی اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولوی شبلی نے
اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی
اور وسعت نظر کے مولانا قائل ہوتے جاتے تھے اس سے زیادہ سید صاحب اُن کی
تلاش و جستجو اور طلب روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے .... سید صاحب
کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے اور مولانا
شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم جو اُن دنوں شائع
ہوئی تھی "صبح اُمید" ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب
کی برکت سے اُن کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُر لطف اور مؤثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے
اور اسی زمانے میں علی گڑھ کے ایک طالب علمانہ تھیٹر میں انھوں نے اپنی ایک
قومی نظم سُنائی تھی" (۱۲۷)

مصنف کا مقصد تو یہ ہی کہ مولانا کو سرسید سے نہیں بلکہ اُن کے کتب خانے سے محبت تھی اور سرسید کو اپنی عقلی گرہ کشائیوں کی امداد میں مولانا کی امداد کی ضرورت تھی، کتب خانے کی محبت تو ہر اہلِ علم کو ہوتی ہی مگر عقلی گرہ کشائیوں کی امداد محض ایک ایجاد ہی کیوں کہ مولانا شبلی کی اب تک تو کیا سرسید کے بعد بھی عرصے تک اپنی ہی عقلی گرہ کشائیوں کی کوئی مثال نہیں اُن کی تصنیف و تالیف اور مقالات و مضامین کا دائرہ مورخانہ تحقیقات اور شاعری تک محدود رہا۔

مولانا نشتر نے بھی جو کچھ لکھا ہی وہ بھی محلِ نظر ہے سرسید کے اعتقادی و کلامی اور مورخانہ تحقیق کا بڑا زمانہ وہ ہے جب کہ مولانا شبلی علی گڑھ میں آئے ہی نہ تھے ۱۸۸۴ء تک تفسیر القرآن کی چار جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور تہذیب الاخلاق جو سرسید کے ادبی و علمی مضامین کا جلوہ گاہ تھا ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۷ء تک بند رہا پھر سرسید کا جو دور ۱۸۸۲ء سے شروع ہوا اُن کی دوسری قسم کی مصروفیتوں کا تھا کالج کے کاروبار کی وسعت، فراہمی سرمایہ کی تدابیر اور اس غرض سے دورے والیسرائے کی کونسل کی ممبری پبلک سروس کمیشن اور دوسرے اہم کمیشنوں میں شرکت ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس اُس کے اجلاسوں کا اہتمام روئدادوں کی ترتیب کانگریس کی مخالفت پیٹریاٹک اور ڈیفنس ایسوسی ایشنوں کے قیام اور اُن کے کام سب اسی دور (۱۸۸۲ء تا ۱۸۹۷ء) میں ہی ہوئے مولانا نشتر نے یہ بھی بڑا مبالغہ کیا ہی کہ "سید صاحب کوئی کام بغیر اُن کے مشورہ کے نہ کرتے تھے" کاموں کی نوعیت ہی بتا رہی ہی کہ کس قدر شاعرانہ مبالغہ ہی، پھر آخری پانچ برس میں (۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۸ء) مولوی وحید الدین تسلیم پانی پتی لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے مولانا کے پاس رہتے تھے اور جن کاموں کی نسبت مولانا شبلی سے کی گئی ہی وہ اُن سے متعلق تھے۔

مثنوی صبح امید ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی اور بقول مصنف جس کو مولانا نے بعد کو

اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا تھا (۱۳۹) اور طالب علمانہ بھیٹر کی نظم ۱۸۹۴ء میں کہی تھی مگر مولانا تشر رسنے دونوں کا زمانہ ایک ہی کر دیا ہی،

مصنّف حیات نے مولانا کی مستقل تصنیف "المامون" کا ذکر بڑے آب و تاب سے کیا ہی جو ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی لیکن جدید اضافوں کے ساتھ دوسرے اڈیشن پر سر سید کے دیباچے کا اشارہ بھی نہیں کیا اس سے قبل کتاب پر تقریظ کا تو دستور تھا جو معاصرین لکھتے تھے لیکن سب سے پہلی کتاب "المامون" ہی جس پر ایک جلیل القدر ہم عصر نے دیباچہ لکھا اور جس سے کتاب میں چار چاند لگ گئے۔

مولانا شبلی کی یہ تاریخی تحقیق و تنقید اور مورخانہ رسائل و تصانیف دراصل سر سید ہی کا فیضِ صحبت یا اُنھی کے ایک خواب کی تعبیر ہے انھوں نے جولائی ۱۸۶۹ء میں لندن سے مولوی سید مہدی علی خاں (محسن الملک) کو ایک خط میں لکھا تھا:-

"انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہی اور جو بات کہ از راہِ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہو اس کو وہ سچ واقعی سمجھتے ہیں اس لیے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید اور ضروری ہی۔"

اس کے بعد فتح اندلس اور کروسیڈ کی صحیح تاریخیں لکھے جانے کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف کی ایک تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ایک عجیب بات سنیے کہ جو کتاب چھپ چکی ہی اس میں مصنف نے

لکھا ہو کہ جو الزام جلا دینے کتب خانہ مصر کا نسبت حضرت عمرؓ لگایا جاتا ہو
غلط ہو یونانی و رومی تاریخوں سے ثابت ہو کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر
کے وقت میں جلا (بے وقوف شیخی پسند بعض ناواقف مسلمان مورخوں نے
اس واقعہ کو جب مسلمانوں نے فتح مصر کی اس کے ساتھ لگا دیا) اس امر کا
ایسا مستحکم ثبوت دیا ہو کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر نے جلایا جس میں ذرا بھی شبہ
نہیں ہو سکتا۔" (مجموعہ خطوط سرسید)

(۲) کالج پر مولانا کے اثرات، یہ ایک طویل الذیل عنوان ہو اور ایک ذیلی
عنوان میں مصنف نے مولانا کی شاعری اور سر سالار جنگ اول کے مرثیہ کے متعلق لکھا ہو:۔

"مولانا کی یہ شاعری کی قوت بھی کالج کی نام وری میں بہت کام آئی جتنے
اکابر و امرا یہاں آئے ان کو دزدِ ملت سے آشنا اور کالج کی ہمدردی اعانت
کی طرف ملتفت کرنے میں مولانا کی شاعری نہیں ساحری بڑا کام دیتی تھی
(۱۵۲) ذاتی طور پر ہمیشہ امرا کی مدح سرائی کو عار سمجھا لیکن قومی کام کی ضرورت
کی بنا پر وہ اس ننگ کو گوارا کر کے فرمائشوں کی تعمیل کرتے تھے مگر یہ بات
ان کو دل سے پسند نہ تھی اس لیے یہ فرمائشی نظمیں اُن کے فارسی کلیات
میں جگہ نہ پاسکیں (۱۵۳) یہ مرثیہ شاید اس لیے بھی کلیات میں جگہ نہ پا سکا
کہ مولانا کے مخصوص انداز سے اس کا رنگ ہلکا اور مزہ پھیکا ہو لیکن بہرحال
مولانا سے اس کو نسبت ہو اور اس کا علی گڑھ سے دکن تک پورا اثر پڑا
تھا اس لیے یادگار کے طور پر حاشیہ میں پورا مرثیہ نقل کر دیا جاتا ہو" (۱۵۴)

اب ایک اور موقع پر لکھتے ہیں کہ

"خیر مقدم کے جلسوں کے پروگرام کا ضروری جزو مولانا کی نظم ہوتی تھی
اس تعلق سے تمام معزز مہمانوں سے وہ نہ صرف روشناس ہو جاتے تھے

بلکہ اُن کے فضل و کمال کا سکّہ ان مہانوں کے دلوں پر ثبت ہو جاتا تھا خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیالہ سر آسماں جاہ صدر اعظم حیدر آباد جنرل عظیم الدین خاں مدار المہام رام پور سے وہ اسی طور سے روشناس ہوئے تھے اور سب نے ان کی قابلیت کا اعتراف کیا، (۸۱۲)

واقعات کی روداد صحیح یہ ہو کہ کالج میں مولانا کی پہلی نظم مرثیہ سالار جنگ ہو جو تقرر کے پہلے مہینے میں لکھی سالار جنگ کا سانحۂ رحلت ۸ر فروری ۱۸۸۳ء کو ہوا مولانا حالی نے ایک نظم فارسی لکھی جو ۲۰ر فروری کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی مولانا شبلی کے دل میں اسی کو دیکھ کر جذبہ پیدا ہوا اور ۲۷ر فروری کی اشاعت میں شائع ہونے کو دیدی، مصنف نے یہ بھی لکھا ہو کہ ایک خاص جلسہ ماتمی ہوا اور اس میں یہ نظم پڑھی گئی بلا شبہ اسی دن جلسہ ہوا جس میں مینجنگ کمیٹی کے مقامی ممبران شریک ہوئے تعزیت کے رزولیوشن کے بعد شام تک کالج میں تعطیل ہوگئی لیکن روداد جلسہ اس نظم سے خالی ہو یہ ضابطہ کی کارروائی تھی جو چند منٹ میں ختم ہوگئی علی گڑھ سے دکن تک اس کے پورے کیا ادھورے اثر کا بھی شائبہ نہیں، دوسری نظم (مدحیہ) خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیالہ کی آمد ۱۸۸۶ء کے موقع پر ہے جو طعام شب کے بعد سنائی گئی سید محمود نے داد دی اور ممدوح نے شکریہ ادا کیا جس کا ذکر خود مولانا نے فخریہ طور پر اپنے ایک خط میں کیا ہو اور حیات میں بھی صفحہ ۱۵۲ پر حوالہ ہی، اس طرح کی مدح و ستائش کی بدعت مولانا شبلی نے ہی کالج میں شروع کی تاکہ وہ بھی ان امرا میں روشناس ہو جائیں تیسری نظم ۱۸۸۸ء میں سر آسمان جاہ کی مدح میں ہو چوتھی سر وقار الامرا کی آمد پر (۱۸۹۵ء) تھی اس سلسلے میں جنرل عظیم الدین خاں وزیر رام کو منسلک کرنا ستم ظریفی ہے وہ کبھی کالج میں نہیں آئے نہ انھوں نے کالج کو کوئی مدد دی نہ اُن کی مدح میں مولانا کی کوئی نظم ہے البتہ ان کے حادثۂ قتل پر ایک

مرثیہ ضرور ہی مولانا کی یہ شاعری یا یہ ساحری ان کی طبیعت کا مداحانہ جذبہ تھا امرا و اکابر کو دردِ ملت سے آشنا کرنا اور کالج کی ہمدردی و اعانت کی طرف ملتفت کرنا محض مصنف کی خوش خیالی ہے خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیالہ بہت پہلے سے سرسید کے رفیق اور معاون تھے ان ہی کے اثر سے مہاراجہ کی توجہ بھی مبذول ہوئی اور دسمبر ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ تشریف لائے اور گرانٹ مقرر کی نواب سر آسماں جاہ ۱۸۸۳ء سے زمرۂ محسنینِ کالج میں شامل تھے اُن کے عطیے سے پرنسپل حال تعمیر ہوا جس کے مرمریں کتبے پر بھی ۱۸۹۷ء نقش ہے نواب ممدوح نے جو کچھ ذاتی امدادیں کیں یا ریاست سے دلوائیں وہ ان کے معتمد (سکریٹری) مولوی مشتاق حسین وقار الملک کا اثر تھا (حیاتِ جاوید و تذکرۂ وقار) نواب سر وقار الامرا کی مدح سب سے زیادہ بلند تھی مگر وزرائے حیدرآباد کی روایات کے برخلاف اُنھیں کے زمانے میں کالج کو کوئی مدد نہیں ملی صرف پانسو روپے کا وہ عام عطیہ ہے جس کا کتابہ اسٹریچی ہال میں نصب ہے جہاں اور بھی درجنوں ایسے معطیاں کے نام ہیں البتہ مولانا کو ذاتی فوائد ضرور حاصل ہوئے سنہ میں وظیفۂ علمی مقرر ہوا اور سنہ میں نظامت شعبۂ علوم و فنون ملی۔

مولانا شبلی نے ہر موقع پہ ایسی نظمیں لکھی ہیں اور محض اپنی طبیعت کے تقاضے سے، کہیں فرمائش کا ثبوت کیا شائبہ بھی نہیں (۱) قصیدہ تہنیت شادی سید محمود (۲) خیر مقدم مسٹر جوزف بک (۳) ترکیب بند بجواب سپاس نامہ اعیان دکن (۴) تہنیت سلامت ماندن شہزادۂ دکن - اعلیٰ حضرت معظم آصف سابع از حادثۂ بندوق (۵) قصیدۂ تشکر سرکارِ فردوس آشیاں بھوپال (۶) نامۂ تشکر بیگم صاحبہ جنجیرہ (۷) مرثیہ نواب ضیاء الدین خاں نیر (۸) مرثیہ جنرل عظیم الدین خاں پریسیڈنٹ کونسل رام پور (۹) قطعۂ وداعیہ عطیہ بیگم فیضی (۱۰) غیر زباں داں دوست[1] کے خط اُردو کی داد

---

[1] کلیات میں نام کی جگہ نقاط ہیں خطوطِ شبلی میں نام نمایاں ہے یہ غیر زباں داں دوست زہرا بیگم فیضی ہیں۔

(۱۱) نظم متعلق یونی ورسٹی (جس میں ہز ہائی نس آغا خاں کی بھی مدح ہو۔)

یہ بات بھی قابل لحاظ ہو کہ مولانا اپنے نظم لکھنے کے متعلق فرماتے ہیں "میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر لکھنے کے بالکل قادر نہیں یعنی بغیر کسی خاص فوری تاثر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا۔ بارہا احباب نے فرمائشیں کیں اور کئی کئی دن تک طبیعت پر زور ڈالا لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔" (حصہ اول مکاتیب صفحہ ۲۰۰) اس لیے مصنف جن نظموں کو ننگ و عار اور طبع غیور پر بار کہتے ہیں وہ یقیناً تاثرات ہیں اور کسی نہ کسی جذبے پر مبنی خواہ وہ قومی خدمت کا ہو یا نمود و شہرت کا، یا کسی انتفاع کا، جیسا کہ سر وقار الامرا کا قصیدہ، جس کے بعد مولانا حیدرآباد گئے اور علمی وظیفہ مقرر ہو گیا،

یہ امر کہ بعض نظمیں کلیات میں جگہ نہ پا سکیں جامع کلیات کے ذوق کا نتیجہ ہو یا یہ کہ ان کو وہ دستیاب نہیں ہوئیں ہم تو ایسی نظم بھی کلیات اُردو میں پاتے ہیں جس کی نسبت مصنف حیات کا دعویٰ ہو کہ مولانا نے اپنی تصانیف سے خارج کر دیا تھا اور پھر یہ حیرت ہو کہ " وہ مدحیہ نظمیں جو کالج کے خیال سے بعض امرا کے خیر مقدم یا مرثیہ میں لکھیں وہ چوں کہ طبع غیور پر بار تھیں اس لیے ان کو بقائے دوام کا خلعت پہنانا نہ چاہا (۲۲۵)

(۳) **تصنیفات کے ذریعے کالج کی اعانت** کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

"کالج کے زمانۂ قیام تک انھوں نے اپنی تصانیف سے ایک حبہ کا فائدہ نہیں اٹھایا" (۱۵۸) مگر یہ واقعہ بھی مبالغہ سے بیان کیا گیا ہو، مولانا نے اس زمانے (۱۸۸۲ء تا ۱۸۹۸ء) حسب ذیل تصانیف کیں :-

(۱) مثنوی صبح امید (۲) مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (۳) الجزیہ (۴) المامون (۵) سیرۃ النعمان (۶) سفرنامہ۔ ان میں سے پانچ کا حق تصنیف کالج کو دیا، پہلی تین تو بہت مختصر (نظم و مقالات) تھیں مستقل تصانیف میں المامون کی دو اشاعتوں اور سیرۃ النعمان کی ایک اشاعت کا حق کالج کو دیا، ان کو کالج نے چھپوایا اور فروخت

کیا اور بہت ہی معمولی فائدہ ہوا اور ان کا یہ حساب برابر انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتا رہتا تھا، سفرنامے کا حق مولانا نے محفوظ رکھا تھا اور اسی سے زیادہ فائدہ ہوا۔

صفحہ ۲۶۵ پر یونی ورسٹی فارسی کورس کے متعلق لکھتے ہیں کہ " یہ کورس سالہا سال شاید ۱۹۰۵ء یا اس کے بعد بھی چلتا رہا۔ مولانا جب تک کالج میں رہے سو روپیہ سال اس کی آمدنی سے کالج کو دیتے رہے"۔ مگر یہ کورس آخری زمانے میں پروفیسر آرنلڈ[۵] اور مسٹر براؤن کے مشورے سے مرتب ہوا تھا اور اس میں پہلا امتحان ۱۸۹۹ء میں ہوا گویا ۱۸۹۷ء میں یونی ورسٹی نے جاری کیا اور ۱۸۹۸ء میں مولانا نے کالج چھوڑ دیا، یہ سالہا سال کا زور کہاں سے آگیا۔ اس عطیے سے کالج کی رودادیں خالی ہیں۔

(۴) کالج کی شہرت میں مولانا کی تصانیف و مضامین و خطابات کا حصہ:

" اس زمانے میں بھوپال وغیرہ میں کالج کا نام اور اس کے ساتھ حسن ظن اور ریاست کی امداد کا خیال مولانا کی انھی تصانیف کا نتیجہ ہو اسی طرح حیدرآباد میں نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کو کالج کی طرف جس معجزانہ کارنامے نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ بھی یہی مولانا کی تصنیفات ہیں اس کا ذکر سرسید کے خطوط میں ہے جو انھوں نے نواب عمادالملک کو لکھے ہیں" (۱۵۸) " نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی سے مولانا کے تعلقات سرسید کے ذریعے ہوئے یعنی چونکہ نواب صاحب ایک علم دوست آدمی تھے اس لیے سرسید نے نواب صاحب کو اسی راستے سے اپنی تحریک سے وابستہ کیا مولانا کی تصنیفات ان کے پاس بھیجیں اور خود ان سے اس سلسلے میں ایک دو تصنیف کے طالب ہوئے غرض اس طرح مولانا کے نام اور کام سے نواب صاحب کو تعلق خاطر پیدا ہوا"۔ (۲۹۵)

---

[۵] تقریر پروفیسر مارلیسن روئداد کانفرنس ۱۸۹۹ء۔

مگر واقعات اس ادّعا کی تائید نہیں کرتے، ریاستوں سے عموماً جو امدادیں ملتی ہیں
اُن کے وسائل و ذرائع ہوتے ہیں۔ سرسیّد کی زندگی میں جیسے جیسے یہ وسائل پیدا ہوتے
گئے رام پور، پٹیالہ اور حیدرآباد سے امدادیں ملیں، بھوپال میں اب تک کوئی ایسا
وسیلہ نہ تھا اگرچہ علی گڑھ تحریک سے وہاں بیگانگی بھی نہ تھی۔ سب سے اوّلیں تحریک یعنی
سائنٹفک سوسائٹی کے کام پر نواب سکندر بیگم نے ۱۸۶۶ء میں ایک ہزار کی قیمتی
انگوٹھی سرسیّد کو ہدیۃً بھیجی جس کو انھوں نے فروخت کرکے زرِ قیمت سوسائٹی
کے فنڈ میں داخل کردیا (حیاتِ جاوید حصّۂ اوّل و حیاتِ سکندری) ۱۸۷۲ء میں
نواب شاہ جہاں بیگم والیۂ ریاست نے انجمنِ خواستگارِ تعلیمِ مسلمانان کو عطیہ مرحمت کیا،
(روداد ۱۸۷۲ء) اسی زمانے میں والیہ ریاست کا نواب صدیق حسن خاں سے عقد ہوا
اور بھوپال پر متعصبانہ مولویت چھاگئی اور اگرچہ شرفائے بھوپال کے متعدد لڑکے کالج
میں تعلیم پاتے تھے جن میں سے ایک حافظ ولایت اللہ کا ذکر حیاتِ شبلی میں بھی ہی
(گو نام غلط لکھا ہی) مگر یہ اتنے ذی اثر نہ تھے کہ دربار پر اثر ڈال سکتے۔ اس لیے
پندرہ سولہ برس تک امداد کا خیال ہی نہیں کیا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں نواب صدیق حسن خاں
جب وہابیت وغیرہ کے الزام میں حکومتِ تاج کے معتوب ہوئے تو صفائی میں سرسیّد
کی بعض تحریروں سے جو وہابیت کے متعلق تھیں استناد کیا گیا اور اب یہ نام کچھ احترام
کے ساتھ سرکاری حلقے میں آنے لگا، نواب موصوف کے فرزندِ اصغر نواب علی حسن خاں
ایک روشن خیال عالم تھے علی گڑھ تحریک سے ان کو ذرا دل چسپی ہوئی، ادھر سرسیّد کے
خاص دوست منشی امتیاز علی خاں وکیل لکھنؤ جو ۱۸۸۷ء میں صدر کانفرنس بھی تھے ۱۸۸۹ء
میں وزارت پر فائز ہوئے اس طرح ایک وسیلہ اور موقع پیدا ہوگیا وزیر کا والیۂ ریاست
پر خاص اثر تھا اور نواب صدیق حسن خاں کے معاملات میں انھوں نے بڑی کوشش
کی تھی۔ ۱۸۹۱ء میں سرسیّد نے جب ایک وفد کے ساتھ حیدرآباد کا قصد کیا تو چوں کہ

جو علم کے حقیقی کاردان اور شیدا تھے" (۱۸۲)۔

اس کے بعد مولانا کی تصانیف کی قدر شناسی اور سرسید کے خط ۲۰ مارچ کا یہ اقتباس ہو کہ" ان کو (مولوی شبلی صاحب) آپ کی ملاقات کا نہایت شوق پیدا ہوا ہو میرے دل میں کچھ خیالات خام سفر ہندوستان کے پیدا ہوئے ہیں..... اثنائے سفر میں میرا ارادہ حیدرآباد آنے کا بھی ہو اگر ممکن ہوا تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدرآباد لاؤں گا تاکہ وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ آپ کون ہیں" (۱۸۲)

اس وفد میں ارکین تو ٹرسٹیان کالج سید رضا حسین (پٹنہ) مولانا حالی، حاجی اسمٰعیل خاں (دتاولی علیگڑھ) مولوی سید زین العابدین، خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں تھے اور ہمراہیوں میں سید زین العابدین (خلف سید زین العابدین) سید احمد علی (سرسید کے نواسے) طلبائے کالج اور مولانا شبلی رکن اسٹاف اور مصطفےٰ خاں صاحب متعلقہ دفتر انسٹی ٹیوٹ گزٹ) تھے، مولانا اپنی ہی خواہش اور شوق ملاقات سے گئے تھے اور سرسید از راہ قدرافزائی انھیں ساتھ لے گئے تھے، اس لیے کسی سرکاری امتیاز یا شان ریاست کی ضیافت ہی کیا تھی، اس سفر کے یادگار گروپ میں بھی مولانا انھیں ہمراہیوں کے ساتھ ارکین وفد کی کرسیوں کے پیچھے کی صف میں استادہ ہیں (گروپ یونی ورسٹی میگزین) اس موقع پر بشیر باغ میں ایک جلسہ ہوا تھا جس میں وقار الامراء صدر تھے مولانا حالی اور مولانا شبلی نے نظمیں بھی سنائی تھیں، مولانا شبلی کی نظم کے آخری دو شعر اس سفر کی شرکت اور برداشت مصارف[۱] کی وجہ پر شاعرانہ اشارہ ہیں ؎

بعد ازیں جملہ دعا باکہ بنر بیداد خدا	خویشتن را اگر بہ دعا یاد کنیم ہست بجا
یعنی از نسبت آں شاہ گرامی باشم	شہ نظام است و بیند کہ نظامی باشم

---

[۱] سرسید کے ساتھ وفد میں جو اشخاص شریک ہمراہ ہوتے تھے سب اپنے مصارف بہ خود برداشت کرتے تھے۔

(۵) کالج یونین سے مولانا کی دلچسپی | کالج میں ایک یونین کلب تھا جو اب یونی ورسٹی یونین کلب ہے جس میں طلبا تقریریں اور مباحثے کرتے ہیں اس زمانے میں اسٹاف کے ممبر اور سرسید وغیرہ بھی حصہ لیتے تھے حیات شبلی میں ان مباحثوں کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے اور صفحہ ۱۶۰ پر دو مباحثوں کا تذکرہ کیا ہے (۱) کیا ہمارا گزشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا (۲) جمہوری طرز حکومت بہتر ہے یا شخصی، ظاہر ہو کہ یہ مباحثے طالب علمانہ ہوتے تھے اور اساتذہ اور دیگر اصحاب اس لیے شریک مباحثہ ہوتے کہ اسلوب تقریر اور طرز ادا اور اپنی معلومات سے طلبا کو مستفید کریں آخر میں موضوع بحث پہ طلبا کی رائے لی جاتی اور کثرت و قلت آرا سے محرک و مخالف کی کامیابی معلوم کی جاتی۔ پہلا اصل موضوع جس کا اعلان ہوا تھا یہ تھا "ایشیائی طرز تعلیم انڈین یونی ورسٹیز کی طرز تعلیم سے زیادہ تر اپنے مقصد میں مفید اور کامیاب تھی" (حیات شبلی میں دوسرے لفظوں میں مختصر کر دیا گیا ہے) اس کے محرک مولانا شبلی اور مخالف تھیوڈ ار بیک کے ایک طالب علم "عبدالعلی" تھے مولانا اپنی تحریک میں کامیاب ہوئے۔ دوسرے موضوع کے متعلق (جس کا علی گڑھ میں کہیں پتہ نہیں اور نہ محمڈن کالج ہسٹری میں جو فہرست مضامین درج ہے اس میں یہ موضوع ہے) مصنف لکھتے ہیں کہ

"مولانا فرماتے تھے کہ جلسے میں سید صاحب بھی موجود تھے مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی اور اس موضوع پر ایسی مدلل اور موثر تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے ان کی موافقت میں رائے دی، یہ امر سید صاحب کے مذاق سیاست کے سراسر خلاف تھا انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف تقریر کی بلکہ ایک مضمون بھی لکھا تب جا کر ان کے دل کی بھڑاس نکلی، سرسید نے اپنا یہ مضمون ایشیائی اور اسلامی طرز حکومت کے عنوان سے ۲۸ جون ۱۸۸۵ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپوایا تھا" (۱۶)

اسی واقعۂ مفروضہ کو دوسری جگہ (صفحہ ۲۹۴) پر دہرایا ہے "مولانا شبلی مرحوم

ریڈیکل ہونے پر طعن کیا ہے لیکن جس مضمون کی بنیاد پر طعن ہے اُس کے آخری فقرہ کو نظر انداز کر دیا ہے یعنی " وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں ان پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیئے جب زمانے کی حالت ان کے عمل میں لانے کے موافق ہو، نہ کہ اس حالت میں جب کہ زمانے کے حالات ان کے موافق نہ ہوں (حیات جاوید صفحہ ۴۴۴ طبع سوم)

(۶) محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین کی ادارت | (۱) " انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ کالج کی طرف سے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین کے نام سے ایک ضمنی رسالہ نکلتا تھا جس میں کالج کے حالات مجلسوں کی روئدادیں انجمنوں کی تقریریں اور اکابر کالج کے مضامین چھپتے تھے ۱۸۹۴ء میں یہ مستقل علمی رسالہ بنا اس نئے انتظام میں مولانا مرحوم نے اس کے اردو حصے کی اڈیٹری قبول فرمائی" (۱۶۱)

(۲) " ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ میگزین کی اڈیٹری کی ذمہ داری جو مولانا کے سر ڈالی گئی اس سے مجبور ہو کر ہی مولانا کو اس زمانے میں متعدد مضامین لکھنے پڑے" (۲۲۷)

مگر واقعہ یہ ہے کہ اس جدید انتظام میں جو خود اساتذہ نے کیا تھا یہ ایک عزت تھی جو مولانا کو دی گئی انگریزی حصے کے اڈیٹر پرنسپل (مسٹر بیک) قرار دیے گئے دونوں حصے ایک ساتھ چھپتے تھے مولانا اگر منظور نہ کرتے تو کوئی مجبوری نہ تھی انھوں نے تو بہ خوشی اڈیٹری قبول فرمائی اور وعدہ کیا کہ " میں اس رسالے کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا" (۱۶۲) اور واقعی کوشش کی عمدہ عمدہ مضامین خود لکھے اور دوسروں سے لکھوائے اور اسی تجربہ سے رسالہ الندوہ میں کام لیا اب "سر ڈالی گئی" اور "مجبور ہو کر لکھنے پڑے" کے الفاظ جو مصنف نے استعمال کیے وہ اُن کے جذبہ منافرت کے ہی ترجمان ہو سکتے ہیں۔

(۷) کانفرنس کی خدمت | " محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام پہلے سرسید نے ایجوکیشنل

کانگریس لگتا تھا چنانچہ ۱۸۸۹ء تک یہ ایجوکیشنل کانگریس کہلاتی تھی مگر جب انڈین نیشنل کانگریس نے شہرت پائی تو پروفیسر آرلین کے مشورہ سے کانگریس کے بدلے یہ کانفرنس بن گئی" (۱۶۲)

"لیکن نام کی تبدیلی ۱۸۹۰ء کے اجلاس میں اس ریزولیوشن کے ذریعے ہوئی جس کے محرک منشی رضا حسین ایم۔ اے تھے) لفظ کانگریس شبہ میں ڈالتا ہے بعض سمجھتے ہیں کہ نیشنل کانگریس کے ہے اور بعض اس کے برخلاف اینٹی کانگریس حالانکہ اس جلسے کو دونوں باتوں سے تعلق نہیں اس لیے نام بدل کر فرق کیا جائے اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قرار دیا جائے" (مرقع کانفرنس)

"۱۸۹۹ء میں کلکتہ کے اجلاس میں مولانا نے بی۔ اے میں فارسی قائم رکھے جانے کے متعلق ایک مدلل اور زوردار تقریر کی تھی، اس کے متعلق زبانی روایت کی بنا پر لکھتے ہیں "اس وقت بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر اوڈبرن بھی اجلاس میں موجود تھے انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں مولانا کی اس تقریر کا حوالہ دے کر کہا کہ "مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ میں مولانا شبلی کی طرح پُراثر تقریر کرسکوں" (۱۶۷)

اسی سلسلۂ بیان میں مصنف نے مولانا کی تقریر کا خلاصہ بھی لکھا ہے اگرچہ حوالہ نہیں دیا لیکن اس کو کانفرنس کی ہی رپورٹ سے لیا ہے کیوں کہ مولانا کبھی لکھی ہوئی تقریر نہیں کرتے تھے، رپورٹ میں کانفرنس کے رپورٹروں کا لکھا ہوا خلاصہ موجود ہے اور وہی مصنف کے پیش نظر تھا لیکن اس خلاصے کے بعد ہی لفٹنٹ گورنر کی تقریر کا ترجمہ بھی موجود ہے اس میں یہ فقرہ یا اس کے مرادف کوئی فقرہ نہیں البتہ انھوں نے سیلف ہیلپ کے اصول و فوائد پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کہا کہ "میں اور آپ تمام لوگ واقف ہیں کہ جب تک سیلف ہیلپ نہ ہوگی کوئی اصلی ترقی نہیں ہوسکتی اس کے بارے میں میں اپنے دوست مولوی شبلی شمس العلماء کی مثال دوں گا (صفحہ ۴۵ روداد)

جلسوں سے تعبیر کیا ہے ان جلسوں کی روئداد بھی حیات شبلی میں درج کی گئی ہے نظم خیر مقدم اور مولانا کا ترکیب بند بھی منقول ہے لیکن مولانا کی تقریر شکریہ تک کا ذکر نہیں جس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "یہاں سے کالج کی یاد بحر و بر اور خشک و تر میں ان کی رفیق و ہم دم تھی اور تمام اسلامی ممالک میں کالج کے نام کی عزت اور قدر کی جاتی تھی" (انسٹیٹیوٹ گزٹ ۵ دسمبر ۱۸۹۲ء) اسی طرح مولانا کو تمغۂ مجیدی ملنے کا ذکر تو ہے لیکن فرمانِ سلطانی کی نقل نہیں حالانکہ مولانا نے اپنے سفرنامے میں اس کا چربہ مع ترجمہ شائع کیا تھا یعنی

"شبلی نعمانی آفندی جو دار المعلمین علی گڑھ واقع ہندستان کا معلم اول ہے چوں کہ شاہانہ تلطفات کا مستحق خیال کیا گیا اس لیے اس کو تمغۂ مجیدی درجہ چہارم کے عطا ہونے کے لیے حکم والا صادر ہوا اور اس کی سند کے لیے یہ فرمانِ عالی شان صادر ہوا ۱۴ محرم سنہ ۱۳۱۰ھ"

اب یہ امر غور طلب ہے کہ مولانا جس فرمان کو اپنی عزت کی دستاویز سمجھ کر سفرنامے میں شائع کرتے ہیں مصنف حیات اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس بات کو غلطی پر تو کسی طرح محمول نہیں کیا جا سکتا بجز اس کے کہ مصنف کو علی گڑھ کی اس نسبت کا اظہار گوارا نہیں جس سے یہ تمغہ ملا۔

اس کے بعد تین صفحوں (۲۱۹ تا ۲۲۲) میں ترتیب سفرنامہ کا بیان ہے اور مصنف نے جو کچھ کمال کیا ہے وہ بھی قابل داد ہے، اوّل یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ مولانا کا ارادہ قسطنطنیہ کے دوران قیام میں ہی سفرنامہ لکھنے کا تھا، وہ اکثر سرسید کو مختصر خط لکھا کرتے تھے جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتے رہتے تھے ایک خط کے ساتھ وجہ اختصار پر سرسید کا یہ نوٹ بھی تھا کہ تفصیل سفرنامے میں ہوگی جو مولانا لکھیں گے مولانا نے ۲۵ مئی کو خود بھی لکھا تھا کہ "حالات دلچسپ ہیں اور سفرنامہ کے لیے بہت سامان مل جائے گا" اب اس سلسلے میں مصنف حیات

نے پہلے مولانا کے ایک خط مورخہ ۲۴ اکتوبر کا حوالہ دیا ہے کہ "سفرنامے کے لیے عام اصرار ہے اور تمام اطراف سے مانگ آنی شروع ہو گئی ہے لیکن میرا ارادہ اب تک لکھنے کا نہیں ہے جس کے متعدد اسباب ہیں" اس کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ "مولانا نے ان اسباب کی تشریح نہیں کی لیکن ان متعدد اسباب میں ایک سبب کا ذکر سفرنامے کے شروع میں کیا ہے"

"سفرنامے میں جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی اجمالی حالت انتظام کا طریقہ عدالت کے اصول تجارت کی کیفیت عمارتوں کے نقشے ان میں سے ایک چیز بھی اس سفرنامے میں نہیں البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق متعدد برجا واقعات ہیں اگرچہ وہ اس تفصیل کے ساتھ نہیں جس قدر ہونے چاہئیں غرض جو شخص سفرنامے کو سفرنامے کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہو وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہو ان کی دعوت میں یہ ماحضر پیش کیا جا سکتا ہے" (۲۰۴)

مصنف نے صرف درمیانی فقرہ لے لیا ہے حالاں کہ تشریح کے لیے پورا بیان نقل کرنا چاہیئے، فقرہ محولہ و متذکرہ سے پہلا فقرہ یہ ہے کہ :-

"رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۲ء) میں میں نے قسطنطنیہ وغیرہ کا جو سفر کیا وہ محض ایک طالب علمانہ سفر تھا اور چوں کہ یہ نہ کوئی غیر معمولی امر تھا نہ واقعات سفر میں چنداں ندرت تھی سفرنامہ لکھنے کا میرا بالکل ارادہ نہ تھا لیکن وہاں سے واپس آکر جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا سب سفرنامے کے متقاضی تھے میں نے خیال کیا کہ چوں کہ ہماری جماعت میں سیر و سیاحت کا طریقہ بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح

حالات سے بالکل اطلاع حاصل نہیں ہوتی لوگوں کا یہ تقاضا کچھ بے جا نہیں مجھ کو خود اپنی حالت یاد آئی کہ سفر سے پہلے قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا، یہ اسباب تھے جنھوں نے مجھ کو ان اوراقِ پریشاں کی ترتیب پر آمادہ کیا ورنہ ایسے عاجلانہ اور معمولی سفر کے حالات قلم بند کرنے اور ان کو سفر نامہ یا کتاب الرحلت کا لقب دینا تنک ظرفی سے خالی نہ تھا۔"

"میں نے اگرچہ اس کتاب میں ترکوں کی تمدنی یا ملکی حالت سے کچھ بحث نہیں کی ہے اور اس قسم کی بحث میرے منصب حالت کے لحاظ سے مناسب نہ تھی تاہم اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب و شایستگی کا جو درجہ قائم ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہے۔" (دیباچہ سفرنامہ)

اس دیباچے سے یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا کا سفر محض علمی تھا اور سفرنامہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدتِ قیام بھی مختصر تھی مولانا ملکی زبان سے واقف نہ تھے زیادہ تر مصروفیت کتب خانوں اور مدرسوں کے دیکھنے میں رہی مولانا ملکی و بین الاقوامی سیاست سے نہ تو واقف تھے نہ واقفیت کی کوشش کی نہ سیاسی جماعتوں کے ارکان سے ملے، اُن کے پیش نظر قدما کے سفرنامے بھی تھے، اور سفرنامے کی غرض و غایت بھی اچھی طرح جانتے تھے ان امور پر غور کرنے کے بعد سفرنامہ لکھنے کے متعلق مذبذب ہو گئے اور آتے ہی محمد اسحاق کو ایک چلتا ہوا فقرہ لکھ دیا کہ "اب تک لکھنے کا ارادہ نہیں"[1] مگر اب مصنف حیاتِ شبلی تخلیق واقعات و اسباب کر کے بحث شروع کرتے ہیں کہ

"لیکن ان اسباب میں سے جو اصلی سبب تھا اُس پر اب بھی پردہ پڑا ہوا ہے

---

[1] خط موسومہ محمد اسحاق ۲۴ راکتوبر

واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء کی جنگ روم و روس کے زمانہ سے ہندوستان
کے مسلمانوں کی دلچسپی ترکوں کے ساتھ بڑھ رہی تھی حالاں کہ اس جنگ
میں انگریزوں نے ترکوں کا ساتھ دیا تھا اور ان ہی کے اشارے سے ہندوستان کے
مسلمانوں نے ترکی کے لیے چندے کیے تھے اور بڑا جوش پھیلا
تھا پھر بھی انگریزوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی ترکی کے ساتھ یہ عقیدت
دل سے پسند نہ آئی، اس کے بعد ۱۸۹۶ء میں روم و یونان کی جنگ
ہوئی جس میں انگریزوں کی ہمدردی سراسر یونانیوں کے ساتھ تھی مگر
کامیابی ترکوں کو نصیب ہوئی اس کی ہندوستان کے مسلمانوں کو جو غیر معمولی
خوشی ہوئی اور تمام ہندوستان میں بڑی دھوم دھام سے اس کی خوشی منائی
گئی جس کے معنی یہ سمجھے گئے کہ انگریزوں کا منہ چڑایا گیا اسی لیے سرسید سے
جو ہر حال میں انگریزوں کو راضی رکھنا چاہتے تھے مسلمانوں کی اس
حرکت سے بہت ناراض ہوئے اور اس کے خلاف بہت سخت مضمون لکھا
اور اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ترکی کی عقیدت نکل
جائے اور اتحاد اسلامی کی جو تحریک تیز پکڑ رہی ہے وہ کم زور ہو جائے
مولانا کا ترکی کا سفر خواہ کتنے ہی علمی پردہ میں چھپا ہو پھر بھی اس حقیقت
سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ہندوستان اور ترکی کے درمیان تعلقات
کی پہلی کڑی تھی اور مولانا اسلامی ہندوستان کے پہلے سفیر تھے جو ترکی گئے۔
قسطنطنیہ کے قیام کے زمانے میں اپنے جوش و عقیدت کو پوری طرح
دبانے کے باوجود وہ شیر پلونا جنرل عثمان پاشا تک پہنچ ہی گئے اور وہاں
سے تمغۂ مجیدی کا تحفہ ہندوستان لائے، اس واقعے نے اندر ہی اندر
انگریزی حلقوں کے ارباب بست و کشاد کو چراغ پا کر دیا اسی نتیجہ [illegible]

جنگ کے موقع پر انھوں نے خود فنڈ کھولا تھا اور چندہ جمع کرکے بھیجا تھا ترکی سے متعلق
انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اہم مضامین شائع ہوتے رہتے تھے ۱۸۷۷ء میں وہ ہزایکسیلنسی
سید احمد خلوصی سفیر دولتِ عثمانیہ کو، جو دہلی آئے ہوئے تھے پروگرام تبدیل کرا کے
علی گڑھ لائے جن کے ساتھ قونسل جنرل متعینہ بمبئی اور دیگر ارکان سفارت بھی تھے
انھوں نے کالج کے نشان میں بھی ہلال کو رکھا اور کالج یونی فارم میں ترکی کوٹ اور
ترکی ٹوپی رکھی، اُسی زمانے میں نہیں بلکہ اُسی ہفتے میں جب کہ مولانا کا خیر مقدم
ہوا ایک ترک افسر (امیر عالائی شاکر آفندی ڈاکٹر دولتِ عثمانیہ مامور برائے
تحقیقاتِ ہیضہ) ۲۴ نومبر کو علی گڑھ آئے اور پروفیسر مدرسین اور کالج کے بورڈروں
نے ان کی الگ الگ دعوتیں کیں، بورڈروں کی طرف سے سالار منزل میں دعوت
تھی، اس میں مسٹر آرنلڈ (پروفیسر) نے ایک مختصر تقریر میں ملکۂ معظمہ قیصرۂ ہند کا
جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے اس یگانگت و اتحاد کا ذکر کیا جو "سلطنت برطانیہ اور
دولتِ عثمانیہ میں ایک عرصے سے قائم ہے اور جو کہ ملکۂ معظمہ اور سلطان المعظم کے
کے مابین نہایت اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا ہے" (مولوی) بہادر علی (طالب علم) نے
سلطان المعظم کا جامِ صحت بہ زبان عربی تجویز کیا اور اس تعلق کو بیان کیا جو
بہ لحاظ اخوتِ اسلامی سلطان کو تمام مسلمانوں سے ہے اور جو تمام پولٹیکل اور
سوشل تعلقات سے زیادہ مضبوط ہے، پھر مولانا شبلی نے عربی میں مہمان کے کمالات
و فضائل اور سلطان خلافت پناہ کی شاہانہ توجہ اور التفات کو بیان کیا جو ہر
ملک اور ہر خطے کے مسلمانوں پر مبذول ہے اس کے بعد اپنی وہ پُر جوش نظم پڑھی
جو بروز عید قسطنطنیہ میں لکھی تھی اور جب ایک مصرعے میں سلطان المعظم کا نام آیا
تو آفندی ممدوح اور اُن کے ساتھ حاضرین نے سر و قد تعظیم ادا کی، آفندی نے
ترکی زبان میں تقریر کی اور مولانا شبلی نے اس کا ترجمہ سُنایا، اس زمانے میں

اتفاقاً سرسید الٰہ آباد میں تھے انھوں نے اس جلسۂ دعوت کی یہ روئداد جو اسی ہفتے کے اخبار میں شائع ہوئی تھی ملاحظہ کی تو "مبارک باد" کے عنوان سے نوٹ لکھ کر بھیجا جس میں اس کے نہایت شان و شوکت اور خوش اسلوبی سے منعقد ہونے پر اظہار مسرت کر کے مبارک باد دی تھی اور افسرانِ کالج اور بورڈوں کی کارروائی پر پرجوش شکریہ ادا کیا تھا یہ روداد اور مبارک باد انسٹی ٹیوٹ گزٹ نومبر و دسمبر میں شائع ہوئی تھی۔

مولانا شبلی اسلامی ہندوستان اور ترکی کے تعلقات کی پہلی کڑی نہ تھے نہ اسلامی ہند کے پہلے سفیر تھے اسی قریب زمانے میں مدراس کے ایک تاجر عمدۃ التجار حاجی محمد عبد العزیز بادشاہ علاقہ مدراس کے سفیر دولت عثمانیہ مقرر ہوئے تھے اور متعدد اصحاب ترکی کا سفر کر چکے تھے اور متعدد لوگوں نے ترکی کی علانیہ حمایت کی تھی ۱۸۸۳ء میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاؤلی (علی گڑھ) نے عرب یورپ اور ترکی کی سیاحت کی اور "گلگشت فرنگ" کے نام سے سفرنامہ لکھا ۱۸۸۴ء میں نواب سالار جنگ ثانی قسطنطنیہ گئے سلطان سے ملاقات ہوئی اور سلطان نے درجۂ اول کا تمغۂ مجیدی دینا چاہا مگر دستور بلا اجازت حضور نظام قبول کرنا مناسب نہیں سمجھا اور انگلستان آکر مسئلہ شرقی اور مسئلہ ترکی پر مضامین لکھے (خط مندرجہ اخبار سرگزشت علی گڑھ)

۱۸۸۸ء میں نواب محسن الملک جب نمائندۂ نظام کی حیثیت سے پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے ایک مقدمہ میں ادائے شہادت کے لیے گئے تو اس وقت کے وزیر اعظم (مشہور دشمن ترکی) گلیڈ اسٹون سے بھی ملے اس ملاقات میں اسلامی سیاسی باہمی گفتگو ہوئی اور نواب ممدوح نے ترکی کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے جذبات و تعلقات ظاہر کیے یہ گفتگو انگلستان کے اخبارات میں شائع ہوئی اور لندن ٹائمز نے تو وزیر اعظم سے جواب پر تنقید بھی کی (تذکرہ محسن)

[illegible]

کی ایک سوسائٹی میں ترکی سلطنت پر ایک تاریخی لکچر دیا جس میں سنہ ۱۴۵۳ تا ۱۸۷۷ء
کے واقعات اور انگلستان اور ترکی کے تعلقات پر روشنی ڈالی اور خود بھی ترکی کا سفر کیا۔

مولانا شبلی نے تو سفرنامے میں علمی و معاشرتی حالات پر اکتفا کیا مگر خادم التعلیم پریس لاہور نے سلطان عبدالحمید خاں کے دوازدہ سالہ عہد حکومت پر ایک انگریز خاتون کی کتاب کا ترجمہ شائع کیا جو الفضل ما شہدت بہ الاعداء کی مصداق تھی۔

۱۸۹۱ء میں اسی مولوی خلیل احمد پروفیسر علی گڑھ کالج نے گریسی کی مشہور کتاب "عثمانی ترک" کی پہلی دس فصلوں کا ترجمہ "کارنامہ ترک" کے نام سے مطبع مجتبائی دہلی میں چھپوایا۔

مولانا کو درجہ چہارم کا تمغۂ مجیدی ملنا کوئی انوکھی بات نہ تھی ۱۸۷۷ء کی جنگ کے بعد جن لوگوں نے چندے کئے تھے ان کو بکثرت یہ تمغے دیے گئے اور سلطان عبدالحمید خاں نے تو انتہائی فیاضی سے تقسیم کیے یہاں تک علی گڑھ کے دو اصحاب جو مولوی سمیع اللہ کے اعزہ کرام ہیں (حاجی مصطفیٰ خاں رئیس بوڑھانا اور حاجی عبدالجلیل خاں) نہ صرف اسی تمغے سے مشرف ہوئے بلکہ بارگاہ سلطانی میں بھی باریاب ہوئے۔ بمبئی کا خاندان فیضی جو برسوں تک بسلسلۂ تجارت قسطنطنیہ میں مقیم رہا اور جس کے ساتھ مولانا کے تاریخی تعلقات ہیں "نشان شفقت" سے سرفراز ہوا جو تمغۂ مجیدی سے بہت افضل ہے۔

وہ بدگمانیاں اور شکوک جو مصنف حیات شبلی کی ذہنی تخلیق یا اختراعی ہیں ان سب میں سے کسی کے حق میں تو آپ سفرنامے کی ترتیب میں نہ ہر روز سیاحوں سے ملنا اور اجازت تحریر وہ باتیں ہیں جو صرف مصنف ہی کے برین دماغ سے نکلی ہیں ورنہ سرسید اور مولانا کی تحریروں میں تو کوئی وجود نہیں۔

طباعت سفرنامہ کو بھی اسی ذہنی یا وقتیہ ریزی سے ایک افسانہ بناکر پیش کیا گیا ہے حالانکہ بات یہی تھی کہ کالج کی طرف سے مولانا کی یہ کتاب شائع ہوئی تھی [illegible]

انھوں نے کالج کو یا سفرنامے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھا تھا اسی لیے اپنے اہتمام سے اسی مطبع میں چھپوایا جس میں کالج کا تمام تر نگی طباعت کا کام ہوتا تھا۔ کیوں کہ انسٹی ٹیوٹ پریس میں لیتھو نہ تھا۔

صفحہ ۵۸۷ پر مصنف لکھتے ہیں کہ "اس زمانے میں ترکوں کا نام لینا برٹش گورنمنٹ کی سیاسیات کی نگاہ میں بڑا جرم تھا۔ مولانا نے اس جرم کا ارتکاب کیا اور ہر چند کہ ترکی کے سفرنامے کی ترتیب میں اس کا علمی و تعلیمی ہی پہلو پیش نظر رہا سیاسیات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا مگر یہ خفیف جرم بھی عفو و درگزر کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ان کو سلطانی ایلچی ہونے کا ملزم ٹھیرایا گیا اور اُن کے پیچھے خفیہ پولیس لگائی گئی۔ انتہا یہ ہے کہ مولوی عبدالرزاق کان پوری مصنف البرامکہ نے اس سفرنامے پر ریویو لکھا تو کانپور کے کلکٹر نے ان کو بلوا کر ڈانٹا کہ تم برطانی رعایا ہو کر سلطانِ روم کی تعریف کرتے ہو اور مولوی صاحب کو معذرت کرنی پڑی۔"

حاشیہ پر یہ نوٹ بھی ہے کہ "یہ دونوں واقعے مولوی عبدالرزاق نے جو مولانا کے اسی زمانے کے ملنے والے اور دوست ہیں اپنے مضمون "یاد ایام" میں لکھے ہیں" لیکن یہ مضمون ہنوز کہیں شائع نہیں ہوا۔

مصنف نے اس واقعہ کا تو حوالہ دیا لیکن اس سے اہم حوالہ جو ایک ایسا واقعہ ہے جس سے صاحب حیات کی علمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے قصداً چھوڑ دیا جس کو ہم مولوی عبدالرزاق صاحب کے مسودہ[۱] سے ہی پیش کرتے ہیں :-

یاد ایام نمبر ۶ — شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی کے متعلق میں نے جس قدر لکھا ہے وہ اُن کی مفصل سیرت

---

[۱] یہ رسالہ ابھی طبع نہیں ہوا۔

نہیں ہے بلکہ یہ متفرق حالات ہیں یا وہ لطائف ہیں جو بیچ کی صحبتوں میں پیش آئے
مولانا کی نسبت میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سرسید احمد خاں بہادر کی دوازدہ سالہ
صحبت سے ان کو از حد نفع پہنچا اور شبلی سے شمس العلما مولانا شبلی ہو گئے اور ان
میں روشن خیالی، بلند نظری پیدا ہوئی اور وہ ٹھیٹ مولویت جو دماغ پر محیط تھی
جاتی رہی اس کے ثبوت میں وہ مذہبی رسائل ملاحظہ ہوں جو مولانا نے ابتدا میں لکھے
لیکن باوجود ان حالات کے افسوس ہے کہ مولانا نے اپنی کسی تصنیف میں فراخ دلی
سے سرسیّد کا نام نہیں لیا۔

سرسید احمد کی پہلی برکت تو یہ تھی کہ مولانا نے سید کی فرمائش سے "گزشتہ
تعلیم مسلمانان" پر ایک مقالہ لکھا چنانچہ یہ مضمون ان کی آئندہ تاریخ نگاری کا
دیباچہ تھا اور اسی سلسلے میں مدرستہ العلوم کی پروفیسری بھی ہے جس پر مزید روشنی
یہ پڑی کہ ان کو پروفیسر آرنلڈ جیسے فلسفی کی شاگردی نصیب ہوئی اور ان سے فرنچ
زبان حاصل اور دیگر مغربی و مشرقی علما جداگانہ تھے اگر یہ ماحول نہ ہوتا تو مثل دیگر
مولویوں کے وہ بھی ایک متعصب ملا ہوتے جس کے نظایر بے شمار ہیں۔ نذیر احمد دہلوی نے
ایک عام جلسے میں ان کو مولوی کہہ کر مشہور عام کر دیا یہ لطیفہ مولانا کے لکچر میں ملاحظہ فرمایئے علاوہ بریں فارسی
اور اردو شاعری میں شمس العلما مولانا شبلی نے جو ترقی کی اور منظر عام پر آئے یہ سب مدرستہ العلوم کی علمی
زندگی کا نتیجہ تھا اور عمر کا اخیر حصہ مذہبی خدمات میں صرف کیا حقیقت یہ ہے کہ ان کی رحلت سے لطف
زندگی جاتا رہا اور مجھ کو جو صدمہ پہنچا وہ قابلِ اظہار نہیں۔ افسوس ہے۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے"

بصورت اشتباہ ایسے سیاسی معاملہ میں خفیہ پولیس حکومت لگاتی ہے اور یہ
بھی ضرور تھا کہ افسران کالج کو اطلاع دی جاتی اس صورت حال میں مولانا کالج
سے رخصت کر دیے جاتے مگر ان کو تو ۱۴ ماہ بعد ہی خطاب ملتا ہے ایک

بدگمانی وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ مولانا خود حکومت برطانیہ کے جاسوس بن کر ترکی گئے تھے اور مسٹر آرنلڈ کے زیر ہدایت انھوں نے وہ خدمات انجام دیں جن کے صلے میں ان کو شمس العلما بنایا گیا۔

مولوی عبدالرزاق کا بیان قابل یقین ہے وہ یہ بھی نہیں بتاتے کہ کس اخبار میں ریویو شائع ہوا بہرحال کسی اخبار میں شائع ہوا ہو اُس کا مالک ناشر بھی برطانوی عایا تھا اس کو بہت زیادہ تنبیہ کی جاتی کیوں کہ مضمون نگار سے زیادہ فتنے دار ناشر ہوا کرتا ہے مگر اس کا کوئی ذکر نہیں پھر کس قدر حیرت ہے کہ سفرنامہ شائع ہوتے ہی جولائی اور اگست میں مولوی وحید الدین سلیم اور شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں کے معترضانہ ریویو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ہی شائع ہوئے مگر کسی سے پرسش وجو نہ ہوئی اور ایک معمولی مضمون نگار کے ریویو پر یہ نوٹس لیا جاتا ہے۔

اس سلسلۂ بیان میں چند اور نکات بھی قابل غور ہیں (۱) مولانا شبلی کو نہایت بلند آہنگی سے جمہوریت پسند ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور رینن کی تقریر کو ثبوت میں دکھایا گیا ہے جس تقریر کے بعد مولانا سفر روم کو روانہ ہوئے ہیں اور تین مہینے قسطنطنیہ میں ان کا قیام رہا ہے۔ یہ تاریخی واقعہ گزر چکا ہے کہ سلطان عبدالحمید نے تخت نشین ہونے سے قبل جس پارلیمنٹ کا وعدہ کیا تھا اس کو تخت پر قدم رکھتے ہی قائم تو کر دیا مگر بہت جلد توڑ دیا اور مدحت پاشا کو جس سے یہ وعدہ کیا تھا اور اس کو صدر اعظم بھی بنایا تھا گرفتار کر کے قید کر دیا اور بالآخر طرح طرح کی اذیتوں سے مروا ڈالا، اس زمانے میں اصلاحات کا تخئیل بھی جرم تھا اخبارات و جرائد کی زبان بند کر دی گئی تھی تقریر و تحریر کی آزادی نہ تھی (مولانا اس پر افسوس بھی ظاہر کرتے ہیں) قصر یلدز جاسوسی کا مرکز بنا ہوا تھا سازشوں کی گرم بازاری تھی، اتحادِ اسلامی کی تحریک کے علم بردار یا داعی سید جمال الدین افغانی بھی قسطنطنیہ میں مقیم

تھے عرب ممالک میں مرکز خلافت کے خلاف جذبات برافروختہ تھے مصر ہاتھ سے
نکل چکا تھا بلقانی ریاستیں آزاد ہو چکی تھیں اور دولتِ عثمانیہ کی بقا یورپ اور خصوصاً
روس و برطانیہ کی رقابت کی رہنِ منت تھی کیوں کہ ٹرکی کی بحری و بری فوجی طاقت
اتنی بھی نہ تھی کہ کسی ایک سلطنت کا مقابلہ کر سکے۔ سلطان نے سلطنت کے ساتھ
دُنیائے اسلام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے تحریک خلافت شروع کی تھی
جو سید جمال الدین کی تحریک اتحادِ اسلامی سے جدا چیز تھی اور دونوں کا نقطۂ نظر
مختلف تھا، ان تاریخی واقعات کو (جو ناقابلِ انکار ہیں) پیشِ نظر رکھ کر دیکھنا چاہیے
کہ اگر مولانا شبلی جمہوریت کے دلدادہ اور ہینِ اسلامی تھے تو سُلطان عبدالحمید کی
مدحت طرازی کیا معنی رکھتی ہے پھر ایسی مدحت جس میں کوئی حقیقت نہ ہو بلکہ
ناموزوں بھی ہو جائے ؎

قاعدۂ دولت و دیں را مدار — آئینہ رحمتِ پروردگار
شاہِ فلک کوکبہ عبدالحمید — اَیَّدہُ اللہ بنصرٍ مزید
جز تو کہ ہست اے شہِ انجم سپاہ — آں کہ بود شرعِ نبی را پناہ
تازگیِ بدر و حنین از تو ہست — زیب و طرازِ حرمین از تو ہست

مصنف اِن اشعار کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ "مگر یہ حقیقت کیوں تھی کیا محض
اس لیے کہ دولت و ثروت اور جاہ و اقتدار کے نظارے نے ان کو مرعوب کر دیا
تھا، نہیں بلکہ اس لیے کہ اس جاہ و حشم کے آئینے میں اُن کو اسلام کی حیاتِ ملی کا
تابناک چہرہ نظر آ رہا تھا...... یہ نظم دراصل نہ شخصی مدح تھی نہ ممدوح کو
سُنا کر صلہ حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی بلکہ قومی حیات کی رجز خوانی تھی
اور ملی تفاخر کا جوش تھا جو بے ساختہ زبانِ قلم سے تراوش کر گیا ہے۔(۲۰۶)
حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا شبلی کو اس وقت تک نہ تو سیاست سے کوئی لگاؤ

تھا اور نہ بین الاقوامی سیاست کی ہوا لگی تھی وہ ماضی کے بہترین داستان گو تھے لیکن مستقبل دیکھنے کی نظر نہ تھی وہ اب تک ترکی کے زوال سے جو سنہ ۱۸۲۱ء سے شروع ہو کر سلطان عبد الحمید خاں کے زمانہ میں تیزی سے ترقی پذیر تھا ناواقف محض تھے۔ ورنہ قومی حیات کی رجز خوانی نہ کرتے اور نہ تفاخر ملّی کا جوش لہریں مارتا، مولانا جذبات کی رَو میں بہ جاتے تھے۔ سلطان کا یہ ظاہری طمطراق اور شان و شوکت ہی دیکھ کر بے قابو ہو گئے اور دیوانہ وار پکار اُٹھے۔ ؏ تازگی بدر و حنین از تو ہست پھر اس وقت تک سلطان کو کسی جنگ میں فتح حاصل ہوئی تھی کہ "ایدہ اللہ بنصر مزید" کی دُعا صادق آتی مولانا خود دینی سیاسیات سے اتنے کنارہ کش تھے کہ قسطنطنیہ میں سید جمال الدین افغانی تک سے نہ ملے جو علمی و سیاسی شخصیت و شہرت رکھتے تھے سلطانی مہمان تھے اور ہندوستان کا سفر بھی کر چکے تھے۔ مولانا کا دائرۂ ملاقات صرف علمی اصحاب تک محدود رہا اس لیے ان کے سفرنامے میں کسی سیاسی زہر کا وہم بھی نہیں ہو سکتا، نہ اُن کا مسلم پبلک پر کوئی سیاسی اثر تھا اور نہ مذہبی تقدس اور عالمانہ وجاہت تھی، نہ ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی حیثیت سے وہ پبلک پلیٹ فارم پر آئے تھے وہ صرف ایک مورّخ و ادیب اور شاعر کی حیثیت سے متعارف و مشہور تھے۔

تمغۂ مجیدی ظاہر ہے کہ بغیر سفارش نہیں مل سکتا تھا، حسین حبیب آفندی ہندوستان میں سفیر رہ چکے تھے اور علی گڑھ تحریک سے واقف تھے جو انھیں کے زمانۂ سفارت میں شروع ہوئی تھی بلکہ وہ خود قاضی العسکر سید احمد فلومی کے ساتھ ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ آ چکے تھے اور اب علی گڑھ کی شہرت ممالک اسلامیہ[۱] تک پہنچ چکی تھی (جیسا کہ خود مولانا نے اپنی تقریر میں بیان کیا) مزید برآں مصنف کی روایت

---

[۱] جب کالج میگزین جداگانہ حیثیت سے شائع ہونے لگا تو مترجم وزارت خارجہ نے ایک چٹھی کے ذریعے اُس کو اپنے نام جاری کرایا۔ محمڈن کالج ہسٹری (۱۷۸)

کے مطابق مولانا کے نام سے بھی چندہ مجروحان ترکی کے سلسلے میں اسی زمانے سے آشنا تھے، اس صورت میں ہندوستان کے ایک بڑے مسلم تعلیمی ادارے کو مرہونِ منت بنانے کے لیئے ایک اعلیٰ عہدہ دار پولیس کی سفارش پر تمغۂ مجیدی درجۂ چہارم کا مل جانا کوئی اہم بات نہ تھی جو اس سلطان کے زمانے میں عام بات ہوگئی تھی۔

(۹) الفاروق کی تصنیف پر اختلافِ رائے

علی گڑھ کی زندگی اور سرسید کے تعلقات

میں الفاروق کی تصنیف کے واقعے کو بھی مصنف حیاتِ شبلی نے ایک عجیب و غریب رنگ میں پیش کیا ہے اور اس کے لیے آٹھ صفحے ۲۳۲ تا ۲۳۶ وقف کیے ہیں، لکھتے ہیں :-

"مولانا نے الفاروق لکھنے کا ارادہ المامون کے بعد ہی کیا تھا بلکہ کچھ لکھ بھی لیا تھا اور اس کی شہرت لوگوں میں پھیل چکی تھی لیکن تاریخ طبری[1] جو اس کے لیے بہت ضروری کتاب تھی وہ چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی اس لیے کچھ دنوں کے لیئے رک جانا پڑا...... سیرت النعمان کے دیباچے میں جو جنوری ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی وہ رقم طراز ہیں

[1] یہ واقعہ بھی قابل لحاظ ہے کہ تہذیب الاخلاق کے دورِ اول میں نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں نے حضرت عمرؓ پر ایک مضمون لکھا تھا جس کا ماخذ چار کتابیں (۱) تاریخ یافعی (۲) تاریخ الخلفاء (۳) ازالۃ الخفا (۴) تاریخ طبری تھیں جیسا کہ حاشیہ مضمون پر درج ہے۔ اس طرح الفاروق کی داغ بیل تو پڑ چکی تھی اور تاریخ طبری بھی موجود تھی مولانا شبلی کو اسی مضمون سے مستقل تصنیف الفاروق کا خیال پیدا ہوا اور نواب ممدوح نے بھی اس میں ایسی تصنیف کی طرف توجہ دلائی ہے" یہ امور جن کو ہم نے بیان کیا وہ بطور نمونہ کے ہیں اگر حالات تفصیل سے لکھے جائیں تو ایک بڑی کتاب ہو جائے۔

(تہذیب الاخلاق جلد اول)

المامون" کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں حالاں کہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آسکیں" مولوی حبیب الرحمان شیروانی کے مضمون سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ بعض نادر کتابیں ہندستان میں میسر نہیں آئیں" اور ان کے ممالک اسلامیہ کے سفر کا "ایک مقصد الفاروق کے واسطے مواد فراہم کرنا اور ان کتابوں کا دیکھنا تھا جو ہندستان میں موجود نہ تھیں" خود مولانا نے اپنے سفرنامے کی تمہید میں لکھا ہے کہ "جس زمانے میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا اُسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا۔ یہی خیال تھا جس نے اوّل اوّل سفر کی تحریک دل میں پیدا کی کیوں کہ یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ رہ گیا ہے اُن سے ایک ایسا سلسلۂ تالیف ضرور تیار ہوسکتا ہے" ...... کوتاہ بینوں کی جن بدگمانیوں کی تردید مولانا نے کرنی چاہی ہے اُن میں سے کم از کم ایک بدگمانی بے اصل نہ تھی اور وہ کالج کی وہی مصلحت بینی تھی یعنی یہ کہ الفاروق کا وجود ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں میں سُنی اور شیعی کا فرق پیدا کردے۔ اس زمانے میں کالج کے ہمدردوں میں سب سے قابلِ تعظیم نام نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کا تھا سرسید کا خیال تھا کہ چوں کہ وہ شیعہ ہیں اِس لیے یہ کتاب کالج سے ان کی

بدمزگی کا سبب ہوگی یہ بات اندر ہی اندر چل رہی تھی اور ہنوز فیصلہ نہیں

ہو پایا تھا لیکن مولانا نے اس کے لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اس لیے

وہ اس مصلحت پر کاربند ہونا نہیں چاہتے تھے "

بلاشبہ نواب عماد الملک کالج کے ہمدردوں میں تھے لیکن ان سے بہت زیادہ ہمدرد اور وزرائے نظام پر اثر رکھنے والے محسن الملک اور وقار الملک تھے اُن کی ذاتی امداد میں بھی عماد الملک سے بہت زیادہ تھیں ان میں محسن الملک وہ شخص تھے جنھوں نے تشیع سے تسنن اختیار کیا تھا اور شیعوں کے رد میں اپنی مشہور و معروف کتاب " آیاتِ بیّنات " لکھی تھی اور حضرت عمر پر بھی مضمون لکھا مگر اُن کے ساتھ عماد الملک کی کوئی بدمزگی نہ تھی اور نہ عماد الملک اس طبیعت کے آدمی تھے کہ اپنے تشیع کے سبب کسی پروفیسر کے ایسی کتاب لکھنے پر بدمزہ ہو جائیں اور اس ادارے کی امداد سے دست کش ہو جائیں جس میں کہ مصنف صرف ملازمانہ حیثیت رکھتا ہو ۔

اب ایک اور ایجاد ملاحظہ طلب ہے کہ

" بالآخر یہ طے پایا کہ یہ مسئلہ خود نواب صاحب ممدوح کے سامنے پیش کر دیا جائے چناں چہ سرسید نے ان کو خط لکھا اُن کا جواب جیسا کہ مولانا نے مجھ سے فرمایا تھا یہ آیا کہ اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے اور حیف ہے کہ اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جائے اور ساتھ ہی مولانا کی تعریف و تحسین بھی کی " حاشیہ پر اس کی تائید میں مولانا شروانی کا ایک بیان درج ہے کہ " مولانا جب سرسید کے روکنے سے الفاروق لکھنے کا مصمم ارادہ ترک نہ کر سکے تو سرسید نے عماد الملک کو لکھا کہ تم مولوی شبلی کو اس ارادے سے روکو انھوں نے جواب میں لکھا کہ اسلام میں دین و دنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروق کی ہے لہٰذا اُن کی سوانح لکھنے سے مولانا

شبلی کو نہ دکھیے، سرسید نے یہ خط مولانا کے سپرد کر دیا کہ وقت پر کام آوے۔ یہ
واقعہ خود سرسید نے مجھ سے بیان کیا تھا۔"

بیانات بالا سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ عماد الملک کو اختلاف نہ تھا مگر یہ سمجھنا
مشکل ہے کہ اُن کے خط کو بہ ایں غرض سپرد کرنا کہ وقت پر کام آوے کیا معنی رکھتا
ہے اس کے بعد سرسید کے ایک خط مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۸۹ء[۵] کا حوالہ ہے جس سے
یہ ثابت کیا ہے کہ "نواب عماد الملک کو الفاروق کی تالیف سے جتنا اختلاف
تھا اس سے زیادہ خود سرسید کو تھا" لیکن عماد الملک کو اختلاف ہی کب تھا
زور سخن کے لیے یہ مزید اختلاف پیدا کر لیا گیا اور جس طولانی خط کا حوالہ ہے اس میں
الفاروق کے متعلق صرف یہ فقرہ ہے کہ "الفاروق کی نسبت جو آپ نے تحریر فرمایا وہ
سب درست ہے مگر اس کے ساتھ فیہ ما فیہ بھی ہے اگر کسی کا دل ایسا مضبوط ہو کہ
اس فیہ ما فیہ کو صاف صاف مثل ایسے مورخ کے جو کچھ مذہب نہ رکھتا ہو لکھے
تو بلاشبہ نہایت عمدہ بات ہے مگر کیا مولوی شبلی ایسا کریں گے اگر نہ کریں گے تو
کتاب ردی ہوگی۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید کو یہ اعتماد نہ تھا کہ مولوی شبلی اس
فیہ ما فیہ کو ایسے مورخ کی طرح لکھ سکیں گے جو کوئی مذہب نہ رکھتا ہو اور اس وجہ سے
کی یہ کتاب ردی ہوگی، قرینہ چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب ہوگا جو سرسید نے مولانا شبلی
کو دیکھنے کے لیے دیا ہوگا، اتنی سی بات تھی۔ جسے افسانہ کر دیا۔ تاہم وہ کسی اور کے
مقابلے میں مولانا شبلی ہی اس کام کی سب سے زیادہ قابلیت و اہلیت کے معترف تھے
چناں چہ اسی قریب زمانے میں سرسید کے ہی عقیدت مند مولوی سراج الدین احمد
نے سیرۃ الفاروق شائع کی تو انھوں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۰ مارچ ۱۸۹۲ء

---

[۵] خط کا صحیح سن ۱۸۹۱ء ہے۔

میں ایک مضمون لکھا جس میں مولانا کی تعریف و توصیف اور مصنف سیرۃ الفاروق کی جلد بازی پر اظہار افسوس کیا' اور لکھا کہ ۔

"اور جب ایسے شخص نے جو کیا بحیثیت علم اور کیا بنظر عمدگی تالیف اور کیا بنظر ترتیب مضامین یادگار سلف سے الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور بہت اس کا سامان جمع کیا تھا جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہے اور نہ ہر ایک شخص کا کام ہے اور ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہے تو ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد کو بلا شبہ مناسب نہ تھا اسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے بلکہ اس رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلی کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی" ..... جو کام ان کو نہ کرنا چاہیے تھا انھوں نے کیا بلکہ وہ کام اُن کے قابو سے باہر تھا بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے مخدوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہے ...... جب دونوں کتابیں موجود ہوں گی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا اور اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی بس ان کو کیا پروا ہے کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہے مگر ہم مولوی شبلی کی اس رائے کو کہ بزرگان دین کو بھی ہیروز آف اسلام میں داخل کر کے اُن کی لائف لکھیں ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ اُن سے متفق ہیں وہ لوگ فادر آف اسلام ہیں نہ ہیروز آف اسلام، اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں ہم مولوی شبلی سے اصرار کر رہے ہیں کہ اپنا سفرنامہ ختم کرنے کے بعد الغزالی یعنی لائف امام غزالی لکھ دیں جو نہایت دلچسپ اور بے حد مفید ہوگی خدا اُن کو توفیق دے کہ ہماری بات کو مانیں اس کے بعد جو خدا کو منظور

ہو وہ کریں لیکن اگر اس کے بعد بھی انھوں نے الفاروق لکھی تو ہم اس وقت ان کو جو کہیں گے کہیں گے "۔

اِن واقعات اور تحریروں کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی مصنف حیاتِ شبلی نے جو بدگمانیاں کی ہیں ان کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، بلکہ صاف صاف معلوم ہوتا ہو کہ سرسید کا اختلاف محض ایک ایسا مشورہ تھا جو ایک شفیق مربی اپنے ایک نہایت عزیز کو جو اُس کا تربیت یافتہ ہو اور اُس سے امیدیں بھی وابستہ ہوں بعض نازک موقعوں پر جو اُس کی طاقتِ عمل سے خارج سمجھتا ہو محبت و الفت سے دیا کرتا ہو۔ اور جب وہ عزیز اس کو قبول نہیں کرتا تو وہی لفظ مُنہ سے نکلتے ہیں جو سرسید کے زبانِ قلم سے نکلے کہ "ہم اس وقت جو کہیں گے کہیں گے"۔

اس داستان میں یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ الفاروق کے متعلق سرسید کے جس خط (۲۶ مارچ ۱۸۹۱ء) کا حوالہ ہو اس کے بعد ہی مولانا ۱۸۹۱ء میں حیدرآباد بھی سرسید کی ہمرہی میں جاتے ہیں نواب عماد الملک کے دولت خانے پر علمی صحبتیں رہتی ہیں اور ان صحبتوں سے متاثر ہو کر مولانا ایک عربی نظم لکھ کر سرسید کو دیتے ہیں جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع بھی ہوتی ہو لیکن اس مسئلہ زیرِ بحث کا کوئی ذکر نہیں آتا اسی طرح دسمبر ۱۸۹۶ء میں نواب ممدوح علی گڑھ آ کر سرسید کے مہمان ہوتے ہیں اس وقت بھی خاموشی ہو حالانکہ ایسے مختلف فیہ مسائل ان علمی صحبتوں میں بہت دل چسپ اور اچھے اسلوب پر طے ہوا کرتے ہیں۔

اب مصنف اس کتاب کی تکمیل کے بیان میں کہتے ہیں کہ "۸ جنوری ۱۸۹۹ء کو اس کے چھپ جانے کی بشارت دی جاتی ہو (مہدی افادی) ۹ فروری ۱۸۹۹ء کے اس کے مطبوعہ اوراق ایک ہمہ تن شوق، عزیز دوست، مولانا شروانی کے پاس اس تاکید سے بھیجے جاتے ہیں کہ ابھی کوئی اور دیکھنے نہ پائے (شروانی ۱) مولانا

کو اس کا بڑا اہتمام تھا کہ تکمیل و اشاعت سے پہلے اُن کی کتاب کا مسودہ کوئی نہ دیکھنے پائے فرماتے تھے کہ سرسید مرحوم الفاروق کا مسودہ اور اس کے چھپے ہوئے اجزا دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے میں مسکرا کر یہ جواب دیتا کہ مشاعرے سے پہلے غزل نہیں سُنائی جاتی۔" (۲۴۶، ۲۴۷)

مگر اس بیان میں مولانا شروانی کے نام کے جس خط کا حوالہ ہے وہ یہ ہے:

"تسلیم خط پہنچا مسودہ مطبوعہ ارسال ہے نواب عبدالشکور خاں صاحب کو بھی دکھلائیے گا، لیکن ابھی زیادہ تعمیم منظور نہیں۔"

کس درجہ بعید از قیاس بات ہے کہ مولانا ایک ہمہ تن شوق عزیز دوست کو تو اجزائے مطبوعہ یا مسودہ مطبوعہ بھیج دیتے ہیں اور اُن کے عم بزرگوار (جو صرف ایک رئیس اعظم ہیں) کے ساتھ یہ خصوصیت برتی جاتی ہے کہ خود ہی ان کو دکھانے کی درخواست کرتے ہیں لیکن سرسید جو ہمہ تن مولانا کے مربی و محسن تھے اور جن کو مولانا قبلہ اور مُطاعی لکھتے تھے اور جنھوں نے مولانا کو ہی اس کتاب کے لکھنے کا سب سے زیادہ اہل قرار دیا تھا اُنھیں نہ صرف متعدد مرتبہ مطبوعہ اجزا دکھانے میں مخل کیا جاتا ہے بلکہ عمر و مرتبہ کا لحاظ اور حفظ مراتب کا پاس بھی نہیں کیا جاتا اور وہ جواب دیا جاتا ہے جو تہذیب ادب کے بھی منافی ہے۔ مولانا شبلی کے اکھڑ پن کی شکایت تو اکثر سُنی گئی مگر غیر مہذب ہونا تو کسی کے وہم و خیال میں بھی نہیں آیا۔ سرسید سے زیادہ مولانا اپنی محنت اور رفتہ رفتہ ماضیہ کے مضموان کو طے کر لینے کی داد کس سے پا سکتے تھے۔ مصنف کا یہ طرز بیان ہے کہ سرسید نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ اشتیاق ظاہر کیا اور وہی (نامعقول) جواب سُنا لیکن سرسید کی خودداری کبھی اس جواب کو سننے کے بعد دوبارہ اشتیاق ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی بلاشبہ مولانا کسی کو مسودہ نہیں دکھاتے تھے مگر استثنا بھی تھا چنانچہ

انھی شروانی صاحب کو لکھتے ہیں کہ " ہاں ایک امر بڑا ضروری یہ ہے کہ میں علم کلام کا خاص حصّہ لکھ رہا ہوں آپ کے پاس بھیجوں گا (اور اس شاگردی کی نسبت میں نے آج تک کسی کے ساتھ گوارا نہیں کی) آپ دیکھ کر بتائیے گا کہ کون سا حصّہ رکھنے کے قابل ہے کونسا نہیں" (شروانی ۲۷) اسی طرح سیرت النبی صلعم کے مطبوعہ دیباچے پر جب دیوبند نے نزعہ کیا تو مولانا محمود حسن اور مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی وغیرہ تو اصل مسودہ دکھانے پر آمادہ ہو گئے جس کا تذکرہ راقم کے موسومہ خطوط میں ہے جو مکاتیب شبلی حصّہ اوّل میں شائع ہو چکے ہیں۔

کتاب (الفاروق) کی اشاعت کے نواب عماد الملک سالہا سال زندہ تھے اور مولانا سے ملاقات و مراسلت بھی رہی مگر الفاروق کے متعلق ان کی تحسین و آفرین کا ایک لفظ بھی حیات شبلی میں نظر نہیں آتا۔

۱۰۔ خطاب شمس العلما اور تبریک و تہنیت کے جلسے :۔

" مولانا کی شہرت کا آفتاب اب نصف النّہار کو پہنچ چکا تھا اور لوگوں کو یہ علانیہ نظر آرہا تھا کہ ہمارے ملک کے اس نادرۂ روزگار کی قدر افزائی سلطان روم تو فرمائیں اور انگریزی گورنمنٹ ان کی قدر شناسی کی توفیق نہ پائے، اس سلسلے میں ایک اور بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں یہ بدگمانی پھیلی تھی کہ مولوی شبلی صاحب اتحادِ اسلامی کے مبلّغ اور سلطان روم کے سفیر بن کر ہندستان آئے ہیں۔ اس لیے ان کو ضرورت ہوئی کہ سلطان روم کے اس فرنسی سفیر کو ممنونِ منت بنایا جا سکے اس کے لیے ابتدا خود سرسید کی طرف سے ہوئی۔ ڈپٹی سید زین العابدین صاحب (علی گڑھ) کا (جو اس وقت کالج کے اونچے درجہ کے طالب علم ہوا کرتے) یہ بیان ہے

کہ سرسید نے ان ہی سے انگریزی میں ایک چھٹی لکھوا کر گورنمنٹ میں بھیجی کہ شبلی جیسے فاضل کی قدردانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ تمغہ مجیدی عطا فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ بڑے افسوس کی بات ہو کہ اس فرض سے غافل رہے، اس کے بعد جو ہوا وہ یہ ہو کہ گورنمنٹ نے جنوری ۱۸۹۴ء کو مولانا کو شمس العلما کا خطاب دینے کا اعلان کیا ...... مولانا کو شمس العلما کا خطاب ملنا کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا جس کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا لیکن چوں کہ سرسید کے کالج میں اس کے کسی پروفیسر کو سرکاری خطاب ملنے کا پہلا واقعہ تھا اور سرسید کے رفقا میں اس کی پہلی نظیر تھی اس لیے اس سے اپنے مقاصد کے اشتہار کا کام لیا گیا" (۲۲۷ و ۲۳۸)

مولانا کا مبلغ اتحاد اسلامی بن کر لوٹنا سفارت سلطان اور فرضی سفیر کو مرہون منت بنانا یہ سب فرضی باتیں ہیں جن کا کوئی دور کا شائبہ بھی کہیں نہیں پایا جاتا، اگر بدگمانی پھیلانا صحیح بھی مان لیا جائے تو اُس کا تعلق حکومت ملکہ معظمہ اور حکومت ہند کے دفاتر خارجہ سے ہو سکتا ہو اور صوبے کی حکومت کے ذریعے سے پرنسپل اور سرسید کو اس کی اطلاع دی جاتی۔ انگریز حکام نہایت محدود لفظ ہو اور خود اس لفظ سے ہی یہ فرضی بات معلوم ہوتی ہو البتہ یہ سرسید پر ایک اور حملے کی بنیاد بنائی ہو یعنی یہ کہ وہ بھی انگریز حکام کے ہم خیال تھے اور انھوں نے مرہونِ منت بنانے کی ابتدا کی۔

خطاب کی سفارش بجائے خود ایک اہم تحریر ہو اور پھر ان مفروضہ حالات میں سید زین العابدین سے جو ایک طالب علم تھے اُن سے خط سفارش لکھوانا قرینِ قیاس نہیں اور بعید از احتیاط بھی ہو پھر جو مضمون بیان کیا گیا ہو وہ سفارش کا نہیں بلکہ ملامت کا ہو مولانا کی شہرت کا آفتاب بھی نصف النہار کو نہیں پہنچا تھا بلکہ ابھی تک افق پر ہی تھا بات صرف یہ تھی کہ اس صوبے میں دو کالج نہایت ممتاز اور یک گونہ حریف

تھے میور سنٹرل کالج الہ آباد اور ایم اے او کالج علی گڑھ (پہلے کالج کے پروفیسر مولوی ذکاء اللہ خاں صاحب (سرسید کے خاص دوست) کو یہ خطاب مل چکا تھا اب اس موقع پر جب کہ ہز آنر سر اکلینڈ کالون نے جب کہ وہ سبک دوش ہو رہے تھے سرسید کی سفارش پر کالج کی عزت افزائی کے خیال سے مولانا شبلی کو بھی یہ خطاب دلوایا جو اس وقت علوم مشرقی کے سینیر پروفیسر تھے۔

اس خطاب سے مقاصد کالج کے اشتہار کا کام لیا گیا، یہ ایک پہل سی بات ہے۔

اس سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

اس وقت تک یہ خطاب نااہلوں کو نہیں ملا تھا اس لیے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی اچھی خاصی وقعت بھی تھی پھر مولانا کو جس سن و سال پر یعنی چھتیس سینتیس سال کی عمر میں، اُن کے پیش رووں اور ہم عصروں میں اتنی کم عمر میں کسی کو نہیں ملا تھا ان مختلف اسباب نے مل کر اس کو ایک خاص اہم واقعہ بنا دیا اور اس لیے تبریک و تہنیت کے بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں ملک کے اکابر نے تقریریں کیں۔ معززین نے مختلف گوشوں سے مبارک باد کے تار اور خط بھیجے اخباروں نے تہنیت کے مضامین لکھے "

مصنف حیات نے ۲۶ صفحوں میں کالج کی دو سوسائٹیوں لجنۃ الادب اور اخوان الصفا کے مشترکہ جلسوں کی روداد صدر جلسہ نواب محسن الملک کی تقریر عربی فارسی اُردو کی تہنیتی نظمیں مولانا حالی کی عربی نظم (من الحبیب الی الحبیب) مولانا کی تقریر تشکر یہ سرکاری رسم خلعت کی روداد کمشنر کی تقریر مولانا کا تشکر یہ سب کچھ درج کر دیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ کالج کے علاوہ اور کہاں کہاں جلسے ہوئے جن میں اکابر ملک نے تقریریں کیں۔

مولانا کی تقریر تشکر یہ کو اس فقرے پر ختم کیا ہے:-

"حضرات جب کہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات
کا شکریہ ادا کر رہا ہوں تو نہایت ناسپاسی ہوگی اگر میں اس چیز کا ذکر نہ کروں
جو ان تمام احسانات کا سرچشمہ ہے یعنی ہمارا قومی کالج" لیکن تقریر کا نصف آخر جو بہت اہم ہے
چھوڑ دیا کہ وہ یہ ہے "حضرات میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اگر وہ کوئی پرسنل اور ذاتی معاملہ ہے
تو آپ مہربانی سے ذاتی معاملے کی نسبت بھی مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں
اس کو اس عام مجمع میں علانیہ ظاہر کروں یعنی کالج کے احسانات جو مجھ پر ہیں۔
حضرات یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی
زندگی قرار پاسکتا ہے۔ تو اس کا آغاز۔ اس کی نشوونما۔ اس کی ترقی۔ اس کی
نمود۔ اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اسی کالج سے ہوا ہے — میں یہ نہیں کہتا کہ
یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرہ میں قدم نہیں رکھا تھا
یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور شائع
ہو چکی تھیں لیکن ان کا کیا مقصد تھا۔ آپس کے مذہبی جھگڑے۔ مسلمانوں کی
جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا اس کو اور قوت و
استحکام دینا۔ میں آج سے بہت پہلے فارسی میں شعر بھی کہتا تھا لیکن وہ
کس قسم اور کس درجے کے تھے آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی شاعری کو
اعلیٰ رتبے کی خیال کرتا ہوں بلکہ یہ مطلب ہے کہ آج کی میری شاعری اگر پست
ہے تو اس وقت پست تر تھی۔ غرض یہ جو کچھ میں نے سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی
کی ہے وہ اسی کالج کی بدولت ہے۔ اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج کا
پروفیسر ہوں اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں۔
اے ممبران اخوان الصفا و لجنۃ الادب — آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ
کالج صرف طالب علموں اور اسٹوڈنٹس کو علمی ترقی دلاتا ہے بلکہ وہ پروفیسروں

اور ماسٹروں کی علمی اور اخلاقی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہ طالب علموں کو بی۔اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتا ہے۔ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کو شمس العلما کرسکتا ہے

صاحبو۔ یہ محض ظاہر بینی ہے بلکہ صریح غلط فہمی ہے کہ آپ اس کالج کے فوائد کو یونیورسٹی کے کورس تک محدود سمجھیں علاوہ ان بہت سے فوائد کے جو یہاں کی مختلف سوسائٹیوں مثلاً یونین کلب۔ الفرض۔ اخوان الصفا لجنۃ الادب وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں اور جو اسی کالج کے ساتھ مخصوص ہیں ایک خاص بات اور سب سے بڑی بات جو اس کالج میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ یہاں ایسے اہل کمال جمع ہیں جن کی بدولت کالج بہت سے ایسے مضامین کا درس گاہ کہا جا سکتا ہے جن کا نام و نشان بھی دوسرے کالجوں میں نہیں مل سکتا۔ ہمارے کالج کے احاطہ میں سید محمود، مولانا حالی۔ نواب محسن الملک جمع ہیں اور اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کالج میں فن قانون کا ایسا پروفیسر موجود ہے جس کے نظیر سے تمام ہندستان کے قانونی کالج خالی ہیں۔ ہمارے کالج میں شاعری اور فن شعر کا وہ پروفیسر موجود ہے جو شاعری کا ریفارمر اور خاتمۃ الشعرا ہے ہمارے کالج میں پالٹکس اور انتظام کا وہ بڑا پروفیسر ہے جس نے حیدرآباد کی عظیم الشان ریاست کو انگریزی طرز انتظام کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کیا کسی کالج نے یونیورسٹی میں قانون۔ شاعری۔ پالٹکس کے ایسے بے نظیر پروفیسر کوئی شخص دکھا سکتا ہے۔

حضرات! میں نے بزرگوں کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں ایک نام اور سب سے بڑا نام دانستہ بھولا ہوں کیوں کہ میرے نزدیک یہ بنا اس کالج کا یا کالج کے متعلق جس چیز یا جس شخص کا نام لیا جائے اس

میں اسی بڑے شخص کا جلوہ موجود ہے۔ مصرع

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے"

اگر ہم اس دورِ زندگی کی تمام تنقیدات کو نظر انداز کر کے صرف متذکرہ بالا حصے کو حذف کر دینے پر ہی غور کریں تو اس سے مصنف کے جذبات و رجحانات کا ہی نہیں بلکہ دیانت کا بھی کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ مولانا سے انگریزوں کی سیاسی بدگمانی

مصنف کا بہت زیادہ رجحان یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت میں کسی نہ کسی طرح سیاسی اہمیت پیدا کی جائے چناں چہ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"اس زمانے میں پین اسلام ازم کا ہوّا سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا، سفر رُوم سے واپسی کے بعد مولانا شبلی کے متعلق بھی یہ بدگمانی پھیلی کہ وہ پین اسلام ازم کے داعی اور سلطان کے سفیر بن کر ہندوستان آئے ہیں اور کہ ان کے سفرنامے نے باوجود ہزار احتیاط کے ٹرکی سے مربوط ہونے کی ایک نئی زنجیر پیدا کر دی" (حیات ۲۷۸)

افسوس ہے کہ قابل مصنف نے جمع اضداد کر دیا پین اسلام ازم اور سفارتِ سلطان دونوں ایک دوسرے کی ضد میں پین اسلام ازم کے داعی سید جمال الدین افغانی تھے اور سلطان عبدالحمید خلافت کا اثر پھیلانا چاہتے تھے۔

"شیخ (یعنی جمال الدین افغانی) اسلامی دنیا کو یورپ کے دست بُرد سے محفوظ رکھنے کے لیے اتحاد اسلامی کی ایک شہر پناہ تعمیر کرنا چاہتے تھے ان کی تحریک دفاعی تھی مگر عبدالحمید محض اپنے تخت و تاج کو ذدل کے ہاتھ سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ سیاسی چال چلنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے دشمنوں کو ڈرا دھمکا سکیں اور بحیثیت خلیفہ کے دنیائے اسلام میں اپنا وقار قائم کر کے اپنی مطلقیت کو قوی کر لیں ...... شیخ سمجھتے تھے کہ اسلامی ممالک کے تحفظ

سکا کوئی ذریعہ سوائے اتحادِ اسلامی کے نہیں اور عبدالحمید سمجھتے تھے کہ آلِ عثمان
کے تخت پر ان کی ذات خطرے میں رہے گی جب تک کہ تمام اسلامی
ممالک ان کو خلیفۂ اسلام نہ مان لیں"۔ (آثار جمال الدین افغانی ۲۷۶ و ۲۷۷)
اب بدگمانی کے ثبوت میں مولانا کی واپسی کے بعد کا ایک قصہ شروع ہوتا ہے۔
"اتفاق دیکھیے کہ اسی زمانے میں کالج میں کوئی جلسہ تھا مولانا نے اردو کا
ایک وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا ؎

بزم احباب ہے پُرجوش ہے جلسا کیسا　　جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا

اس میں ایک شعر تھا ؎

نوجوانو یہ حریفوں کو دکھا دینا ہے　　اپنی قوت کو کیا قوم نے یک جا کیسا

اس شعر کو پڑھتے وقت حریفوں کے لفظ پہ بے اختیار انگلی ان انگریزوں کی
طرف اُٹھ گئی جو جلسے میں بیٹھے ہوئے تھے سمجھانے والوں نے ان کو سمجھایا
کہ یہ اشارہ انگریزوں کی طرف تھا اور یہ طالب علموں کو بغاوت کا سبق تھا'
ایک انگریز نے دوسرے سے کہا اور بات عام ہوگئی ....
اسی زمانے میں وہ علی گڑھ سے آتے ہوئے ریل کی کسی بے ترتیبی سے فیض آباد
اُتر گئے اور وہاں کے ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے بنگلے کے خانساماں نے مولانا
کا نام سُنا تو ملنے آیا مولانا نے پوچھا کیسے آئے تو اُس نے کہا کہ کچھ صاحب
لوگ یہاں آئے تھے اور وہ آپ کا نام لے کر کچھ یوں ہی کہہ رہے تھے اسی
سے دیکھنے کو جی چاہا"۔ (۲۸۰ حیات)

اِس روایت پر جو ڈاک بنگلے کے خانساماں کے مجہول بیان پر مبنی ہے اور جس
میں ایسی اہمیت پیدا کی گئی ہے ناظرین ہی تبصرہ فرمالیں تو مناسب ہے ہم صرف قصیدہ
اور انگلی کا واقعہ پیش کریں گے۔

۱۸۸۳ء میں پرنسپل کالج کے والد مسٹر جوزف بک علی گڑھ آئے تھے اُن کی ہر حلقے میں بڑی خاطر مدارات ہوئی، ایک ڈنر پر مولانا نے قصیدہ[1] بھی پڑھا جس کا ترجمہ انگریزی میں اُن کے بھائی نے کیا تھا دعوتوں کے اِنھی ہنگاموں میں مولانا نے اپنے

---

[1] یہ قصیدہ مولانا کے کلیات میں نہیں ہے اس لیے لطفِ سخن اور اس امر کے ثبوت میں کہ مولانا مدحت طرازی کا ہر موقع تاکتے رہتے تھے نقل کیا جاتا ہے۔

چنیں باشد چو دولت یار و طالع سازگار آید ۔۔۔ کہ جوزف بک بہ مہمانی کالج زاں دیار آید

بہ ہر سو جلوۂ رنگِ مسرت را تماشا کن ۔۔۔ کہ جوزف بک بسیرِ ہند با خویش و تبار آید

زمیں از عکسِ رنگِ موکبش در جلوہ پیرائی ۔۔۔ چناں باشد کہ در صحرا بہارِ لالہ زار آید

زہے مجموعۂ اخلاقِ حسن صورت و سیرت ۔۔۔ کہ نگیں از نگارش در نظر گل در بہار آید

بقسم بر خویش می بالد دلم بر خود ہمی جوشد ۔۔۔ کہ ہم چوں صاحبے ممدوح را بر ما گزار آید

زیمنِ مقدمش ترتیب دارم بزمِ تو امشب ۔۔۔ عروس آسا کہ در پیرایش نقش و نگار آید

خوشا ترتیب بزم آرائی ایں جلسۂ رنگیں ۔۔۔ کہ حسنِ اتحادِ ہم دگر بر روے کار آید

بہ یک سو میزباں را مہماں در پہلوئے الفت ۔۔۔ بہ یک سو مہماں را میزباں اندر کنار آید

تو گوئی خانۂ امشب صحنِ اشجار مسرت شد ۔۔۔ کہ پیدا از در و دیوار شاخ برگ و بار آید

ز فر مقدمش گیرد بنائے کالج اعزازے ۔۔۔ کہ قصرِ اعتبارِ قوم ما زیں استوار آید

کنوں مر افسرانِ کالج و اسکول را حاصل ۔۔۔ ز تشریفِ قدومش صد وقار اندر وقار آید

مسلسل رشتۂ نظمم امواجِ گہر مانند ۔۔۔ کہ ہر بیتم ز وصفِ سلکِ دُرِ شاہوار آید

سخن دل چسپ رنگیں تر و لیکن مختصر گفتم ۔۔۔ کہ خوبی در سخن حاصل ز لطفِ اختصار آید

ترا اقبال و جاہ و حشمت از ہر سو فرا گیرد ۔۔۔ گہے اندر یمیں باشد گہے اندر یسار آید

ہمیشہ دشمنانت را بہ ساغر زہرِ ناکامی

ترا دائم مے نابِ مسرت خوش گوار آید

یہاں بھی طلبا کی دعوت کی مسٹر جوزف بک، سر سید اور دیگر ممبران اسٹاف (انگریز و ہندستانی
بھی مدعو تھے اس دعوت میں بھی ۲۶ شعر کا ایک قصیدہ تھا مطلع کے بعد یہ دو شعر اس
موقع پر قابلِ ملاحظہ ہیں:

صفحہ عیش کی سطریں ہیں برابر دیکھو — میز کے گرد یہ مجمع ہی صف آرا کیسا
صف بہ صف لوگ ہیں اور صدر میں وہ سید پاک — دیکھ لیں لوح پہ کھلتا ہو یہ طغرا کیسا

اور ایک شعر یہ تھا کہ

نوجوانو یہ زمانے کو دکھا دینا ہو — اپنی قوت کو کیا قوم نے یک جا کیسا

لیکن مصنف حیاتِ شبلی نے "زمانے" سے "حریفوں" کا لفظ بدل کر ایک واقعہ کی
بنیاد قائم کر دی ہو، حالاں کہ کلیات شائع کردہ دارالمصنفین میں لفظ "زمانہ" موجود ہو۔

اس قصیدے میں دو جگہ حریف کا لفظ بھی آیا ہو:

تم بھی سن لو کہ حریفو کبھی انشاء اللہ — قافلہ قوم کا منزل پہ وہ پہنچا کیسا
اے حریفو تمھیں خالق کی قسم سچ کہنا — شبلی خستہ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا

لیکن اس لفظ حریف کو کبھی قابلِ اعتراض تصور نہیں کیا گیا اور ۱۸۹۲ء میں پینی ریڈنگ
کے مشہور جلسہ نمایش میں جس میں کہ انگریز پروفیسر اور حکام ضلع بھی موجود تھے پھر ایک
طالبِ علم نے یہی اشعار سنائے۔ کس قدر حیرت ہو کہ ۱۸۸۵ء میں انگلی اٹھنے سے انگریزوں
میں تو بات عام ہو جاتی ہو حتیٰ کہ ایک ڈاک بنگلے کے خانساماں تک پہنچتی ہو مگر سر سید مسٹر
بک پرنسپل وغیرہ تک نہیں پہنچتی اور چھ سات سال بعد وہ ہی اشعار پھر پڑھے جاتے ہیں
جس میں انگریز بھی تھے۔

مولانا کی سیاسی اہمیت میں قوت پہنچانے کے لیے اب ایک اور بیان ملاحظہ ہو

"کالج میں مولانا کی رائے کئی دفعہ یونین کے جلسوں میں ظاہر ہو چکی تھی وہ شخصی
سلطنت کو مضر سمجھتے تھے اور جمہوریت کے حامی تھے اس عرصے میں کانگرس

کا غلغلہ اُٹھا تو وہ اس تحریک کے مدّاحوں میں نکلے ابھی یہ آواز دبنے نہیں
پائی تھی کہ ۱۸۹۳ء کے اخیر میں ندوۃ العلما کی آواز اٹھی اور اس زور سے
اٹھی کہ معلوم ہوتا تھا ہندستان میں مولویوں کی حکومت قائم ہو جائے گی،
مولانا اس صدا پر لبیک کہنے والوں میں سب سے آگے تھے ان سب باتوں
نے مِل ملا کر اُن کے خلاف بدگمانیوں کا اچھا خاصا مسالہ اکٹھا کر دیا"

اس بیان سے پہلے تک کالج کی مدّتِ ملازمت میں صرف ایک مرتبہ اوائل ۱۸۹۲ء میں مولانا کی سیاسی رائے کے اظہار کا بیان تھا اب "کئی دفعہ" تازہ اختراع ہی پھر اس عرصے میں کانگریس کا غلغلہ نہیں اُٹھا بلکہ آٹھ سال قبل ۱۸۸۵ء میں اُٹھ چکا تھا اور مولانا کی مدحت طرازی اس کے ۲۸ سال بعد ۱۹۱۲ء میں شروع ہوئی ہی اس دوران میں پبلک طور پر تو کجا اُن کے پرائیوٹ خطوط میں بھی اس کا اشارہ نہیں۔

ندوہ کی آواز کا زور بھی مصنّف کا اختراع ہی ۱۸۹۳ء میں یہ تحریک اٹھی ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کالج اور کانفرنس نے زبردست تائید کی۔ کالج سے (ناظمِ دینیات) مولوی عبداللہ انصاری بھی شریک ہوئے تھے۔ عرصے تک حکومت کے نزدیک بھی ندوہ ایک خالص مذہبی و علمی تحریک تھی تاآں کہ خود بقول[۵۱] مصنّف ندوہ کی تحریک کے اوج کے زمانے میں صرف منشی محمد اطہر علی۔ مشہور وکیل کو شکست دینے کے لیے چودھری نصرت علی (سندیلہ) نے صوبۂ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر میکڈانلڈ کو بدگمان بنایا، مصنف نے اس بدگمانی کا زمانہ بھی ۱۹۰۰ء و ۱۹۰۱ء متعین کیا ہی اور یہ بھی تسلیم ہی کہ ۱۹۰۲ء میں مطلع صاف ہوگیا اور مولانا حیدرآباد میں ناظم محکمۂ علوم و فنون ہوئے اور وہاں سے واپس آکر سرکاری کمیٹیوں میں سرکاری طور پر منتخب ہوتے رہے، لہٰذا بدگمانیوں کا کوئی سوال ہی نہیں آتا۔

---

۵۱ صفحات ۲۵۲ و ۳۰۳ حیات شبلی۔

سرسیّد سے کش مکش اور اختلاف

حیاتِ شبلی کے ۲۸۱ تا ۲۹۶ صفحات میں یہ عجیب و غریب داستان سے جس کو مصنّف کی حقیقت نگاری، دقیقہ سنجی اور معنی آفرینی کا شاہکار سمجھنا چاہیے تخلیق واقعات اور قیاسات و ظنیات سے جس طرح مصنّف نے کام لیا ہے وہ واقعی ایسے ہی محقق و نقاد کا کام ہے لکھتے ہیں کہ

"اب جیسے جیسے دن گزر رہا ہے سید اور شبلی میں وہ اگلا سا ارتباط اور پہلا سا اعتراف نہیں رہا ہے اور اب وہ موقع آرہا ہے کہ ان کو سرسیّد کے حلقے سے باہر آجانا پڑے اس اختلاف حال اور کش مکش کے اسباب گو "حیاتِ جاوید" میں جگہ نہ پاسکے مگر تاریخ کے اوراق سے گم نہیں ہوئے ضرورت ہے کہ جہاں تک حیاتِ شبلی کا تعلق ہے ان اسباب پر ایک نظر ڈال لی جائے اور گو مولانا نے کہیں تصریح نہیں کی مگر ان کی تحریروں کے پردہ سے اب بھی روشنی چھن چھن کر نکل رہی ہے اگر ہم ان شعاعوں کو یکجا کرلیں تو ان اسباب پر دن کی سی روشنی پڑنے لگے گی، سرسیّد میں ساری خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہم نشینوں سے آمنا وصدقنا کے سوا کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

اس تمہید کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں ٹرسٹیز بل اور سیّد محمود کی جانشینی وغیرہ کے اختلافات کو بہ انداز خاص بیان کیا ہے مگر اس بات کا اشارہ تک نہیں کہ مولانا شبلی ان اختلافات میں کس طرف اور کس کے مؤید تھے ان واقعات میں ان کی زندگی کا تعلق کسی ایک کی تائید و اختلاف سے ہی ہوسکتا ہے مصنّف نے یہ بات قصداً چھپائی ہے کیوں کہ مولانا کی تائید سے وہ بے خبر نہ تھے انھوں نے اسی ایّامِ اختلاف ۱۸۹۱ء میں سیّد محمود کی شادی کی تقریب پر ایک تہنیتی قصیدہ لکھا تھا جس کے تین

شعر یہ ہیں:-

باپ کی طرح تم اب قوم کا ہو پشت وپناہ	جانشینی کے لیے کون ہے تجھ سے افضل
ایک عالم کو مسلّم ہے ترا فضل وکمال	پھر نہ مانے کوئی حاسد تو جنوں کا ہو خلل
قوم کی چارہ نوازی بھی ہے تجھ پہ لازم	تجھ کو خالق نے بنایا ہو جو مسعود ازل

یہ قصیدہ کلیات اُردو شائع کردہ دارالمصنفین میں موجود ہے اسی طرح جب لوی سمیع اللہ خاں نے الہ آباد میں ایک مسلم ہاسٹل بنایا تو مولانا نے اس کی تاریخ "مسجد ضرار" نکالی۔
۱۳۰۸

اب دیکھیے کہ سرسید کی کم زوری (آمریت) مولانا کی نظر میں کیا تھی اور وہ اس سے تنافر رکھتے تھے یا پسند کرتے تھے اپنے حبیب لبیب موثق حیات شیروانی کو لکھتے ہیں کہ "ندوہ میں سیکڑوں امور بے ضابطہ ہوتے رہتے ہیں اس کی تو کچھ پرسش جو نہیں لیکن نصاب کے متعلق آپ کو اس قدر ضابطہ کی پابندی ہو کہ ایک ایک حرف پر جب تک سب کا اتفاق نہ ہولے کچھ کیا نہیں جاسکتا۔ مکرمی اس طرح کام نہیں چلتا۔ سید صاحب نے اس طرح کام نہیں چلایا۔ (مکاتیب شبلی ج۲ صفحہ ۱۵۱)

تمہید کے بعد مصنف نے اختلافی شعاعوں کو سلسلے وار دکھایا ہو اور ہم بھی سلسلے وار ہی تبصرہ کرتے ہیں۔

پہلی شعاع "سرسید پر مولانا نے سب سے پہلی تنقید اپنی سب سے پہلی تصنیف گزشتہ تعلیم میں کی رسالے کے بیچ میں تراجم کا بیان ختم کرکے ایک ریمارک کے نیچے لکھا تھا جس کا ماحصل یہ ہو کہ عربوں نے عربی زبان میں دنیا کے علوم کا ترجمہ کرکے اپنے زمانے میں جو ترقی کی اس قیاس پر آج عمل نہیں کیا جاسکتا۔ سائنٹی فک سوسائٹی کے بانیوں کو عربی کے اس واقعے سے دھوکا ہوا اور وہ یہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ترجموں کے ذریعے سے

علوم کو ترقی دی ہم بھی یورپ کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے علوم اور قوم کو ترقی دیں گے یہ خیال غلط تھا کیوں کہ ان ترجموں کے لیے لاکھوں روپیہ درکار ہیں جو خلفائے عباسیہ کے زمانے میں ممکن تھا اور اب غیر ممکن ہے دوسرے یہ کہ اس زمانے میں علوم محدود تھے اور ترقی رک چکی تھی جس قدر کتابیں ترجمہ کر لی گئی تھیں یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کر لیا گیا تھا اور اس زمانے میں نہ علوم کی ترقی کی انتہا ہے اور نہ کتابوں کے شمار کی حد ہے تیسری بات یہ کہ اس زمانے میں عربی اسلامی ملکوں میں حکمراں زبان تھی اور اردو حکمراں زبان نہیں اور دنیا میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ قوم نے اس زبان میں علوم و فنون کو ترقی دی ہو جو اُن پر حکومت کرنے والی نہ ہو؛ آخر میں تھا، مگر ہم کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ خود سید احمد خاں صاحب نے جو سائنٹفک سوسائٹی کے بانی ہیں متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہلکا سا اعتراض بھی، جس کی معذرت بھی کر دی گئی تھی، سرسید کو پسند نہیں آیا تھا کیوں کہ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں اس سرسری بات کے جواب دینے کی ضرورت محسوس فرمائی اور حاشیے کا ایک پورا صفحہ اُس کے لیے نذر کیا اور بتایا کہ یہ خیال خود سرسید کی تحریروں سے ماخوذ ہے مولانا شبلی کا آپ پیدا کیا ہوا نہیں۔"

مصنف نے تمہید میں کش مکش و اختلاف کے آغاز کا کوئی زمانہ معین نہیں کیا لیکن پہلی شعاع سے خود بہ خود معین ہو جاتا ہے یعنی مولانا کے کالج میں آنے کے چار سال بعد ۱۸۸۶ء سے۔ بہر حال سرسید کی ناپسندیدگی اور حیاتِ جاوید کا جواب دونوں کو اس طرح مربوط کیا گیا ہے کہ گویا سرسید نے اپنی لائف میں یہ جواب لکھوایا ہے، حالاں کہ مولانا شبلی کا وہ رسالہ جس میں یہ ہلکا سا اعتراض ہے ۱۸۸۷ء میں لکھا گیا اور خود سرسید نے

کانفرنس کی طرف سے شائع کیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۰ جولائی ۱۸۹۳ء میں ایک تعریفی ریویو لکھا جس میں یہ فقرہ بھی تھا کہ اس فہرست کے خاتمے پر مصنف نے نہایت سچا اور واقعی اعتراض ہماری سائنٹفک سوسائٹی پر کیا ہے جس کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے" اس فقرے ہی سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف حیاتِ شبلی کی تخلیق ناپسندیدگی کیا وزن رکھتی ہے، حیاتِ جاوید میں مولانا حالی نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے، سرسید کی وہ تحریریں جن سے مولانا شبلی کا خیال ماخوذ ہے مطبوعہ[1] صفحات میں ہنوز موجود ہیں اور حیاتِ جاوید میں ایک اقتباس بھی ہے۔

دوسری شارع "مذہبی اختلاف" کی ہے۔ اس کی تمہید میں یہ اعتراف ہے کہ

مولانا میں سرسید کی صحبت سے مذہبی عقل پسندی آگئی تھی اور عقل و نقل کی تطبیق کا ذوق پیدا ہوگیا تھا اور اشاعرہ کے بہت سے مسائل کی خامیاں اور غلطیاں ان کو نظر آنے لگی تھیں" وغیرہ وغیرہ "۔ لیکن دفعتاً یہ شارع نظر آئی ہے، سید صاحب اپنی تفسیر اور اپنے مضامین میں جو تاویلات کیا کرتے تھے ان کے لیے وہ مولانا سے جس قسم کی معلومات چاہتے تھے گو وہ ان کے لیے مہیا کر دیتے تھے مگر وہ خود ان کی اس قسم کی تاویلات کو پسند نہیں کرتے تھے اسی لیے مولانا نے ان کو آہستہ آہستہ عقل پسندی کی آزاد شاہراہ سے ہٹا کر امام غزالی، رازی ابنِ سینا اور قاضی ابن رشد کی تصنیفات سے آشنا اور معتزلہ کے خیالات سے باخبر کیا اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرسید کی آزاد خیالی جس کی وسعت کی کوئی حد نہ تھی آخر میں حکما اور متکلمین اسلام کے خیالات تک محدود رہ گئی "۔

یہاں تک تو کوئی شارع اختلاف نہیں بجز اس کے کہ دونوں نے ایک دوسرے

---

[1] ملاحظہ ہو "ہماری زبان اور ہماری اعلا درجے کی تعلیم ۱۸۸۸ء" لکچر بہ مقام جالندھر ۱۸۸۸ء مجموعہ لکچر ز و اسپیچز

کے خیالات کو متاثر کیا، اگرچہ کوئی ثبوت سرسید یا خود مولانا شبلی کی تحریروں میں یا کوئی مستند زبانی روایت بھی ایسی نہیں کہ شبلی سرسید کے لیے معلومات مُبتینہ فراہم کرتے تھے اور انھوں نے حکما و متکلمین اسلام کے خیالات و تصانیف سے سرسید کو آشنا کیا، جن سے سرسید بے خبر تھے، یہ امر تو مسلّم ہے کہ علی گڑھ آنے سے پہلے مولانا شبلی مقلدی و غیر مقلدی کے دائرے میں چکّر لگاتے رہے اور مسلمانوں میں انتشار پھیلانے اور جو انتشار تھا اس کو بڑھانے میں معروف رہے تھے اور جن تصنیفات و خیالات سے بقول مصنف انھوں نے سرسیّد کو باخبر کیا اُن سے وہ علی گڑھ آکر اور سرسید کی ہی صحبت میں آشنا ہوئے تھے۔ سرسید کی تو متعدد تصانیف اسی رنگ میں مولانا کے علی گڑھ آنے سے پہلے شائع ہو چکی تھیں۔

پھر اس بیان کے بعد لکھتے ہیں کہ

"اسی تصادم سے بچنے کے لیے سرسید کی زندگی بھر مولانا نے عقائد پر کوئی کتاب کیا کوئی رسالہ یا مضمون تک نہیں لکھا سرسید اپنے تہذیب الاخلاق کے لیے تقاضہ کرتے تو ٹال جاتے، بہت مجبور کیا تو "المعتزلہ والاعتزال" کے نام سے ایک تاریخی مضمون شروع کیا جو یکم محرم ۱۳۱۳ھ جولائی ۱۸۹۵ء کے پرچے میں چھپا اور اس کو بھی ناتمام چھوڑ دیا جس کو مولوی وحیدالدین سلیم نے ۱۲ر شوال ۱۳۱۳ھ کے پرچے میں "مشاہیر معتزلہ" کے عنوان سے جس طرح ان سے بنا پورا کیا، اس مضمون میں بھی مولانا نے اپنے چھپانے کا اتنا اہتمام کیا کہ صاف صاف اپنا نام شبلی نعمانی لکھنے کے بجائے شبلی کی جگہ "ابلا سعدی" اور "نعمانی" کی جگہ "الاعظمی" لکھا"[1]

لیکن اختلافِ عقائد کا لازمی نتیجہ تو تصادم نہ تھا، سرسیّد کے عزیز ترین دوست

---

[1] تقریر مولانا بہ موقع دعوتِ خطاب۔

خصوصاً سید مہدی علی (محسن الملک) عقائد میں ان کے زبردست مخالف تھے اور تہذیب الاخلاق میں بھی اختلاف کرتے رہتے تھے مگر کبھی تصادم نہ ہوا۔ مصنّف نے مولانا کی حریت خیال کا تو بڑا ادعا کیا ہے اور خود مولانا نے بھی مذہبی مسائل میں سرسید سے اختلاف کا ...... دعوی کیا ہے تو محض تصادم سے بچنے کے لیے عقائد پر کچھ نہ لکھنا ایک مہمل بات اور دل کی کم زوری کا ثبوت ہے اور پھر یہ بھی کوئی وجہ کش مکش نہیں ہوسکتی، بلکہ کش مکش (بشرطے کہ ہو) دور ہونے کی وجہ ہو سکتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ سرسید کی وفات کے بعد بھی عرصے تک مولانا کی فہرست تصانیف میں عقائد پر کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔

اب تہذیب الاخلاق کا مضمون دیکھیے تو مولانا شبلی اس رسالے میں کسی مضمون کے لکھنے سے ہی انکاری ہیں "میں نے تہذیب الاخلاق کے لیے حاشا کوئی مضمون نہیں لکھا" (مکاتیب موسومہ ابوالکلام ۲۷)

تہذیب الاخلاق کے مضامین کے لیے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو لوگ ٹٹی کے اوجھل شکار کھیلنا اور اپنا نام پبلک پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے ان کا کوئی مضمون اس میں درج نہ ہوگا (حیات جاوید صفحہ ۲۳۵) ان دونوں بیانوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مضمون متذکرہ مولانا شبلی کا نہ تھا اور غور کرنے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ یہ مضمون مولوی وحید الدین سلیم کا تھا مولانا شبلی اور وہ دونوں حریف تھے ان میں چشمک تھی اور بقول مصنّف "علی گڑھ کے زمانے میں اُن کے اور مولانا کے درمیان بعض معاملات میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا (۱۰۶ حیات) لہٰذا مولوی سلیم نے مولانا شبلی کو چڑانے کے لیے اپنا نام (الاسدی الاعظمی) قرار دیا جو شبلی نعمانی کی نسبت سے شان دار ہے اور اسی نام سے وہ مضمون شائع کرایا مضمون کے آخر کا فقرہ یہ ہے کہ مذہب اعتزال کی ابتدا ترقی اور تنزل کا یہ نہایت اجمالی خاکہ ہے دوسرے آرٹیکل میں ہم ان فرقوں

کی تفصیل اور ہر ایک عقیدے اور عقائد پر ریویو لکھیں گے تیسرے آرٹیکل میں مشہور رسالے اعتزال کے مختصر حالات ہوں گے، معلوم ہوتا ہو کہ چھپے مضمون کے بعد ان کو تنبیہ ہوا کہ فرضی نام اختیار نہیں کیا جا سکتا تو انھوں نے جب دوسرا نمبر چھپوا کر تیسرا نمبر مشاہیر معتزلہ کے عنوان سے یکم ربیع الاول اور یکم رجب کی اشاعتوں میں لکھا تو اپنا اصلی نام وحید الدین پانی پتی استعمال کیا۔

مصنف حیات شبلی کی یہ ستم ظریفی بھی قابل داد ہو کہ باوجود مولانا کا انکار محض سامنے ہونے کے اس مضمون کو اُن کے مقالات جلد پنجم (سوانح) میں شامل کر دیا حالانکہ اس مابہ البحث مضمون کو سوانح سے تعلق بھی نہیں۔

یہ امر بھی مبہم رہا کہ مولانا کا تہذیب الاخلاق کے لیے مضمون لکھنے کو ٹالنا احساس کم تری تھا یا احساس برتری۔ اس دور کے مشہور مضمون نگار سرسید مولوی نذیر احمد محسن الملک مولانا حالی مولوی چراغ علی سید کرامت حسین مولوی عنایت رسول چڑیا کوٹی وغیرہ جیسے ذی کمال اور اہل علم تھے۔

تیسری شعاع دیکھیے: سرسید اپنی تفسیر کا ترجمہ عربی میں کرانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی مولانا سے جب اس کا ذکر آیا تو انھوں نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا، اس کے بعد مولانا کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نگاہ پڑی جو اس زمانے عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے اور جنھوں نے سرسید کے حکم سے طبقات ابن سعد کے ایک حصے کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا مگر مولانا حمید الدین صاحب نے انکار کیا اور جب سرسید نے بااصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی سے مولانا شبلی کا کوئی تعلق نہ تھا مگر

سرسیّد کی بدگمانی میں اس سے اضافہ ہوا۔"

مصنّف نے اس روایت کا کوئی ماخذ نہیں بتایا نہ زمانے کا تعیّن کیا نہ اس سے قبل کوئی بدگمانی بتائی گئی جس میں اب اضافہ ہونا بیان کیا ہے، مولانا حمیدالدین ۱۸۹۱ء تک ایک طالب علم تھے انھوں نے طبقات ابن سعد کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو چند ورقی رسائل تھے، مگر اب تک انھوں نے اُردو یا فارسی سے عربی میں ترجمے کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا تھا جس سے وہ ترجمہ تفسیر کے اہل سمجھے جاتے اور ظاہر ہے کہ جب تک کسی کو عربی زبان پر قدرت و مہارت نہ ہو جو تفسیر کے لیے ضروری ہے اس سے یہ کام نہیں لیا جا سکتا، پھر ایک طالب علم کو اتنا اہم کام دینا جس میں پورے وقت کی ضرورت تھی کیوں کر ممکن تھا، سرسیّد کی اگر یہ خواہش ہوتی تو وہ ان دونوں کا منہ نہ تکتے بلکہ اور انتظام بھی کر سکتے تھے انھوں نے خطباتِ احمدیہ کا اُردو سے انگریزی میں اور گبن کی رومن امپائر کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں ہزاروں روپیہ صرف کر کے کرایا ہی تھا، اور یہ تو طفلانہ بات ہے کہ کسی نوجوان کی گستاخی سے اُس کے کسی رشتے دار سے کوئی بدگمانی کی جائے۔

چوتھی شعاع عجیب و غریب ہے" سرسیّد دُعاؤں کی قبولیت کے قائل نہ تھے اور اس لیے قبولیت کے لیے دُعا مانگنے کو فعلِ عبث قرار دیتے تھے اس مسئلے پر تہذیب الاخلاق میں ان کے مضامین اور ان کے اور نواب محسن الملک کے سوال و جواب چھپ رہے تھے اسی زمانے میں علی گڑھ کے ایک ہندو بزرگ جو اچھے پڑھے لکھے اور صوفیانہ خیال کے آدمی تھے اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے انھوں نے سرسید کے مضمون الدعا والاستجابت کی تردید میں ایک دل نشین رسالہ شائع کیا جس پر نواب وقار الملک نے نہایت عمدہ ریویو لکھا اور اس ریویو کے سلسلے میں اس پر افسوس کیا کہ سرسیّد

"جو نہ صرف مسلمان اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں بلکہ خانوادہ رسالت کے چشم و چراغ ہیں وہ تو دعا کو جو بندہ اور خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہے غیر ضروری[۵۱] اور فضول بتائیں اور ایک ہندو جس کو کافر کہا جاتا ہے اس کی حمایت کو کھڑا ہو اس رسالے کی قوتِ استدلال اور اندازِ بیان سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس کے مصنف دراصل مولانا شبلی ہیں اور اس شبہ کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اعظم گڑھ میں لکھا گیا جو مولانا کا وطن تھا اور وہ پوسٹ ماسٹر صاحب مولانا کے واقف کار اور شناسا بھی تھے۔"

یہ شگاف مولوی اقبال احمد سہیل ایم اے علیگ کی ایک تحریر منہ رجیہ (رسالہ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) سے چھپی ہے مگر نہ تو اس ہندو بزرگ کا اور نہ ان کے مصنفہ رسالے کا نہ سنہ تحریر کا نہ وقار الملک کے ریویو کا کوئی پتہ نشان کہیں ملتا ہے ریویو کا خلاصہ بھی وقار الملک کے اسلوب و انداز تحریر سے متغائر ہے، پھر اگر اس واقعے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بعض لوگوں کو شبہ ہوا اسے سرسید سے کش مکش و اختلاف کا سبب کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے البتہ ایک شخص جو مولانا شبلی کے طرزِ عمل سے واقف ہے کہ وہ اپنے رسائل و مضامین وغیرہ دوسروں کے نام سے شائع کراتے رہتے تھے تو وہ اس کو قبول کرے گا کہ یہ دل نشین رسالہ بھی انھیں کا لکھا ہوا تھا اور یہ جرأتِ اخلاق کا فقدان تھا کہ خود میدان میں نہ آئیں۔ مصنف حیاتِ شبلی ہی کی روایت کے مطابق وہ "شبلی نعمانی" کی جگہ "الاسدی الأعظمی" بن گئے تھے نیز ندوہ کے قضیوں اور الہلال (اخبار) میں کشاف و وصاف کی نظموں میں بھی نام بدل لیتے تھے۔

پانچویں شگاف میں لکھتے ہیں کہ "ان واقعات کے ساتھ الفاروق کی تصنیف سے جو اختلاف رائے پیدا ہوا تھا وہ بھی شمار کے لائق ہے" اس بحث کو گزشتہ صفحات ۲۲ تا

---

[۵۱] سرسید نے دعا کو غیر ضروری اور فضول نہیں بتایا بلکہ فرضِ عین لکھا ہے۔ (مکاتبات الخلاق)

۲۳۶ میں پورے طور پر کیا گیا ہے اور یہاں چند جملوں میں ختم کر دیا ہے" الفاروق بڑی محنت سے لکھی اور سرسید کے اعتراض و اختلاف اور ناراضی کی کوئی پروا نہ کی" اعتراض و اختلاف تو خیر ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہ "ناراضی" کا لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ جس کی تفصیل پیچھے آ چکی۔

چھٹی شعاع یہ ہے کہ "مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت و بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ مولانا نے ندوہ کے کسی جلسے میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں آگے بڑھتے جائیں لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں پیچھے ہٹتے جائیں یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں" سرسید کو اُن کی تقریر پر بڑا غصہ آیا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحتیں اُس راستے سے پیچھے ہٹا دیں گی جس پر وہ لے جانا چاہتے ہیں چنانچہ اس کے خلاف انہوں نے سخت مضمون لکھا" (۲۹۰)

مصنف نے مسلمانوں کے انگریز ہو جانے کے متعلق حاشیے میں لکھا ہے کہ "یہ تصریح سرسید کی تحریروں میں ہے" لیکن کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا۔ اور ہم کہتے ہیں کہ مل بھی نہیں سکتا کیوں کہ اس کا وجود ہی نہیں، برخلاف اس کے سرسید تو ان مراسم کو بھی ضروری جانتے تھے جن میں مذہب کی ذرا بھی جھلک ہو جیسے بسم اللہ کی تقریب کہ وہ نہ مسنون ہے اور نہ مستحب چنانچہ انھوں نے اپنے پوتے (سر ضیاء راس مسعود مرحوم) کی تقریب بسم اللہ کے موقع پر ایسے مراسم کی اہمیت پر جو تقریر کی ہے وہ اُن کے مجموعۂ

میں موجود ہیں۔ مسلمانوں کا یورپین عورتوں سے شادی کرنا جو مذہباً ناجائز نہیں سرسید کے نزدیک اتنا بُرا تھا کہ جب چند ایسی مثالیں سامنے آئیں تو کانفرنس میں ایک سخت رزولیوشن پیش کیا۔ پردہ شرعی و رسمی اُس زمانے میں بھی ایک اہم موضوع تھا اور سرسید نہ صرف شرعی پردے کے بلکہ رسمی پردے کے بھی زبردست حامی تھے۔[۱] انگریزوں سے اتنے میل جول کے باوجود سرسید کے زنان خانے میں اس میل جول کی ہوا تک نہ پہنچی تھی حتیٰ کہ سرسید کو عورتوں میں تعلیم جدید کی اشاعت بھی گوارا نہ تھی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "سرسید کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ کالج کے طلبا میں بلند ہمتی اور بلند خیالی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انگریزی طور و طریق اور وضع قطع اختیار کریں تا کہ ان میں حاکمانہ روح پیدا ہو، مگر یہ خیال کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ بات اُتر گئی کہ شیر کی کھال اوڑھ کر کوئی شیر نہیں بن سکتا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ حاکم قوم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی قوم سے دور سے دور تر ہوتے گئے تیسری بات یہ ہوئی کہ حاکم قوم کے طور و طریق کی نقالی میں ان کی زندگی کا سرو سامان اتنا گراں ہو گیا کہ قوم کے کام کے نہیں رہے اور وہ تعلیم جو قوم کی دولت مندی کی خاطر ان کو دی گئی تھی وہ اس نقالی کی بدولت تنگ دستی کا ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے وہ قوم کی امداد و اعانت کے قابل نہ رہے اور نہ وہ ایثار کی کوئی خدمت انجام دے سکے مولانا شبلی مرحوم سرسید کے اس خیال کے تمام تر مخالف تھے۔"

مصنف نے خود ہی ایک خیال پیدا اور قائم کر کے ریمارک کر لیا اور آخری فقرے میں مولانا کی مخالفت اضافہ کر دی لیکن حقائق و واقعات کو پس پشت ڈال دیا، سرسید کو اپنی قوم کے نوجوانوں کی جیسی تربیت مقصود تھی اس کو انھوں نے

---

[۱] سرسید نے اس مسئلے پر دو مضمون بھی لکھے ہیں۔

متعدد تقریروں اور تحریروں میں بیان کیا ہے جو نہ صفحات کاغذ سے محو ہوئیں اور نہ اُن کے
آثار و علائم ناپید ہوئے، انھوں نے وقتاً فوقتاً جو تقریریں کی ہیں ان کا جزوی اقتباس
قابلِ مطالعہ ہے۔

(۱) "اگر تم آسمان کے تارے ہو جاؤ اور ہماری قوم میں نہ رہو تو جو تعلق یا رشتہ
میں نے جوڑا ہے وہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے" (۳۹۰ ۔ مجموعہ) (۲) "سب سے اول ہمارا
مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں نیشنلٹی یعنی قومیت اور قومی اتحاد اور قومی ہمدردی
جو اوّل سیڑھی قومی ترقی کی ہے قائم رہے اس کے لیے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ
مسلمان رہیں اور مذہبِ اسلام کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے اور اس
لیئے ضروری ہے کہ ہم انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو مذہبی تعلیم بھی دیں...... پھر ہم
کو اپنی قومیت قائم رکھنے کے لیے عربی زبان کی بھی جو ہمارے بزرگوں اور
پاک مذہب کی زبان ہے، جس قدر ہو سکے تعلیم دینا ہے کم سے کم یہ کہ فارسی
زبان ہی سکھا دیں تاکہ قومیت کا اثر ان میں پایا جائے انگریزی تعلیم کے سبب
سے ان میں سے قومیت معدوم نہ ہونے پائے" (۵۱۳ ، مجموعہ) (۳) جو مسلمان
نوجوان کالج میں رکھے جائیں وہ عمدہ اگر عمدہ نہ ہو تو متوسط حالت میں رکھے
جائیں اُن کے رہنے کے مکانات صاف اور دُرست ہوں اُن کو پاکیزہ اور
صاف لباس پہننے کی عادت ڈالی جائے، سلیقہ سے رہنا اپنے مکان کو
دُرست رکھنا اُن پر لازم کیا جائے سب کو اگر ممکن ہو ایک سی حالت میں
رہنے کی تدبیر کی جائے کھانے کا انتظام ایسی طرح پر ہو کہ جس سے ان کو
کھانے کا آپس میں دوستانہ اور برادرانہ طریقے سے مل کر کھانا آجائے
جو ایک بڑی تدبیر قومی موانست اور قومی یگانگت کی ہے بعض لوگوں کی
رائے اس کے برخلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسی مہذب عادتیں طالب علموں

میں نہ ڈالی جائیں کیوں کہ جب وہ کالج سے نکلیں گے تو اُن کی قسمت میں فی ایک
تلی کے طور پر رہنا ہی وہ ایسی اچھی طرح کیوں کر رہ سکیں گے وہ لوگ ان تمام
تدبیروں سے جوان نوجوان مسلمانوں کو مہذبانہ طریق سے رہنے کی سکھائی جائیں
اس بات کو زیادہ پسند کرتے ہیں کہ غریب مفلس آدمیوں کو جس طرح کہ مسجد
یا خیرات خانوں میں یا خیراتی اسکولوں میں رہتے ہیں یا جس طرح مدرسہ عالیہ
جامع ازہر مصر میں طالب علموں کو ایک گلی میں کھڑا کر کے اُن کے ہاتھوں میں
دو دو یا تین تین خمیری روٹیاں رکھ دی جاتی ہیں اسی طرح یا اس کے مثل
سستا یا آسان طریقہ اخراجات تعلیم کا اختیار کیا جائے تاکہ کثرت سے غریب
آدمی بھی تعلیم پا جائیں، اے دوستو! اگر اس طریقے سے قوم قوم بن سکتی ہے
اگر اس طریقے سے مسلمان بچوں میں آدمیت، عزت، سیلف رسپکٹ پیدا
ہو سکتی ہے اگر تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ تمھارے بچے اس طرح تعلیم پائیں
اور تعلیم کے ساتھ ذلت کی زندگی وہ کمالے جائیں تو بہتر، مگر میری رائے
میں تو اس طریق سے کوئی قوم معزز قوم نہیں بن سکتی جو لوگ اس طرح پر تعلیم
دینا چاہتے ہیں ان کو مناسب ہے کہ خیراتی اسکول و کالج کھولیں مگر یہ نہیں
ہو سکتا کہ جو بچے قوم کے قوم بننے کے لائق ہیں ان کو بھی ان کے ساتھ ملا کر
جن سے کچھ توقع نہیں ہے برباد کر دیا جائے۔" (۲۴۵ مجموعہ)۔ (۴) اے حضرات!
اگلے زمانے میں تعلیم کی صورت دوسری تھی اور تعلیم کے اخراجات بہت قلیل تھے
طالب علم مسجدوں یا خانقاہوں کے حجروں میں رہتے تھے ان کی ایک وقت
کی روٹی کسی گھر سے اور دوسرے وقت کا کھانا کسی گھر سے ملتا تھا مُردوں
کے فاتحہ کی روٹی سویم اور چہلم کے کھانے پر ان کی گزران تھی کہیں لنگر
جاری تھا اور وہی ذریعہ اُن کی گزران کا تھا جن لوگوں کی عمر میرے برابر

یا مجھ سے زیادہ ہی اور جن لوگوں نے مصر کی سیر کی ہی اور جامع ازہر کے مدرسہ اور طالب علموں کو دیکھا ہی انھوں نے یہ سب باتیں اپنی آنکھ سے دیکھی ہوں گی ہندستان میں اب بھی اسلامی مدرسوں میں اس کا نشان پایا جاتا ہی اس زمانے کے طالب علموں کو پہننے کے لیے ایک کرتہ اور ایک پاجامہ اور زیادہ سے زیادہ تکلف ہوا تو ایک لنگی کافی تھی، میرا مطلب اس بیان سے ان کی تحقیر کرنا نہیں کیوں کہ ان طالب علموں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو نہایت مقدس اور قابلِ ادب ہیں بلکہ میرا مطلب اس بیان سے ایک امرِ واقعی کا بیان کرنا ہی اور یہ بتانا ہی کہ اب زمانہ بدل گیا ہی اس زمانے میں وہ سادہ اور کم خرچ طریقہ علوم تحصیل کرنے کا نہیں چل سکتا خصوصاً علومِ انگریزی اس طرح حاصل نہیں ہو سکتے، اور نہ وہ اوصاف طالب علموں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کا پیدا ہونا بہ مقتضیات زمانہ ہم ان میں چاہتے ہیں اور نہ اس طریقۂ تعلیم و تربیت سے ان میں ہمت و جرأت اور سیلف رسپکٹ پیدا ہو سکتی ہی نہ غیرت اور حمیت باقی رہتی ہی نہ ان میں قومی ہم دردی کا جوش پیدا ہوتا ہی نہ قوم کو ان سے قومی بہبودی کی توقع ہو سکتی ہی اُس زمانے میں جو کچھ جلوہ تھا وہ صرف ایسی سلطنت کا تھا جو اُنھی کی ہم خیال تھی جو مسجدوں میں تعلیم دیتے تھے یا تعلیم پاتے تھے مگر اِس زمانے میں سلطنت کا قوموں کا قوموں کی ترقی و بہبودی کا اور علوم کا اور قوم کے غریبوں کی مدد کرنے کا سب رنگ بدل گیا ہی اور جب تک ہم بھی نہ بدل جائیں اور زمانے کے ساتھ نہ چلیں کسی طرح کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

اس زمانے میں بھی مسلمان طالب علم اور شریف خاندانوں کے بچے بہت زیادہ امداد کے محتاج ہیں قوم کے سرداروں اور قوم کے مال داروں

اور قوم کے ترقی خواہوں کو ان کی امداد کرنی ضرور ہی مگر نہ اس سے پہلے طریقے سے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا بلکہ دوسرے طریقے سے جس سے ان طالب علموں کی حمیت، غیرت، سیلف ریسپکٹ میں بھی کچھ خلل نہ آوے اور ان کو تعلیم میں بھی مدد ملے وہ شریفانہ طریقے پر رکھے جاویں تاکہ ان کی حمیت اور غیرت اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی خصلت کو روز بہ روز ترقی ہوتی جائے جو آیندہ کو قومی ترقی اور بہبودی کا ذریعہ ہی" (۵۶۸ مجموعہ)

مولانا شبلی نے اپنے سفرنامے میں جامعۂ ازہر کی یہ حالت (جو سرسید نے بیان کی) زیادہ تشریح کے ساتھ لکھی ہی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ " مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا..... افسوس ہو کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے مسلمانوں کو برباد کر چکا ہی اور کرتا جاتا ہی تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہی اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اس سے حوصلہ مندی بلند نظری، جوشِ ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہی" غرض یہ تربیت تھی جس کو سرسید چاہتے تھے رہا انگریزی طور و طریق اور وضع قطع کا چاہنا تو یہ محض مصنف حیاتِ شبلی کا اختراع اور خواہ مخواہ ایک الزام ہی۔ ہر قوم دوسری قوموں کے اختلاط اور سفر و سیاحت سے متاثر ہو کر تمدن و معاشرت میں تبدیلی کرتی رہتی ہی۔ آغازِ اسلام سے ہی یہ اثرات مترتب ہونے شروع ہوئے اور مسلمانوں میں عجمی تکلفات پیدا ہو گئے حالاں کہ عجم مفتوح و محکوم تھا اور عرب فاتح و حاکم تھے (یہ تفصیل مولانا شبلی کے ایک مقالے "غیر قوموں کی مشابہت" میں پڑھنی چاہیئے) اسی طرح ہندستان مسلمان فاتحین اور مسلمان تجار کے تمدن و معاشرت سے متاثر ہوا، ۱۹ ویں صدی کے آغاز سے مغربی تمدن و معاشرت کی جو لہریں اٹھیں وہ ایشیائی اور اسلامی ممالک تک پہنچیں ہندستان میں بھی انگریزوں کے ساتھ یہ اثرات آئے

مگر غدر ۱۸۵۷ء کے بعد تک انگریزوں کا ایک گروہ اپنے نسلی غرور اور قومی حکومت کے تحفظ سے ہندستانیوں کا بوٹ پہننا بھی گوارا نہ کرتا تھا، اس پر کئی جھگڑے ہوئے[۵۸] گورنر جنرل کو احکام نافذ کرنا پڑے، بہر حال مرد بہ زمانہ کے ساتھ مغربی تمدن و معاشرت کا ہندستان میں رواج ہوتا چلا گیا پہلے بڑے بڑے شہروں اور خصوصاً مدراسی، گجراتی، مرہٹہ بنگالی اور پارسی قوموں میں اس کا رواج ہوا سرسید نے بھی ۱۸۶۹ء میں جب کہ وہ عازم انگلستان تھے ترکی لباس جو انگریزی لباس کی ترمیم شکل ہے اختیار کیا اور کچھ عرصے بعد ان کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کا ایک قومی لباس ہونا چاہیے۔ کالج میں بھی بعض طلبا نے ترکی کوٹ پہننا شروع کر دیا۔ ۱۸۹۵ء میں سرسید نے اپنے اس خیال کو ایک مضمون کی صورت میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا اول انھوں نے ہندستان میں جو لباس مختلف قسم کا ہے اس کو بیان کیا اور پھر لکھا کہ "ہندستان میں سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کو نیشنلٹی قائم کرنے کی ہے جس کو ان کے بزرگوں نے ہندستان میں آکر ڈبو دیا ہے ان کو ایک نیشنل لباس اختیار یا ایجاد کرنا لازم ہے جو نیشنلٹی کا ظاہر کرنے والا ہو..... بلاشبہ ترکوں سے اور ترکوں کی سلطنت سے (گو افسوس ہے کہ نہیں معلوم اس کی عمر کتنی باقی ہے) ہم مسلمانوں کو فخر ہے تمام ہمارے مقدس معبد مکہ معظمہ مدینہ منورہ بیت المقدس سب ان کے زیر حکومت ہیں (گو یہ بات خدا کو معلوم ہے کہ کب تک رہیں گے)۔ اس قوم نے نہایت عمدہ اور ہر موقع کے مناسب ایک لباس اختیار کیا ہے جو بہت حالتوں میں موجودہ زمانے کے مناسب اور قریب قریب اس لباس کے جو ہم پر حکومت کرنے والی قوم کا لباس ہے صرف ٹوپی کا فرق ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کو اپنا نیشنل لباس قرار نہ دیں ہم کو معلوم ہے کہ بعض انگریز اس لباس سے چڑتے ہیں بلکہ ہم ایسے متعصب انگریزوں سے واقف ہیں جو کہتے تھے کہ ہم جس ہندستانی کی ٹانگوں میں

---

۵۸ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھی اس غرور کے خلاف متعدد مضامین شائع ہوئے تھے۔

پتلون اور بدن میں ٹرکش یا انگلش کوٹ اور سر پر لال ٹرکش ٹوپی دیکھتے ہیں تو ہماری
آنکھوں میں خون اتر آتا ہے یہ مغرور اور متعصب انگریز ہندستانیوں کو غلامی کی حالت
میں رکھنا پسند کرتے ہیں اور ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ ہندستانی ان سے دوستانہ
طریقے سے ملیں ...... مگر ہم ہندستانیوں کو ان متعصب اور مغرور انگریزوں پر
خیال کرنا نہیں چاہیے بلکہ خود ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہم کو اپنی قوم کی بہتری کے لیے
کیا کرنا لازم ہے"

سرسید کا خیال تھا کہ کالج میں ترکی کوٹ اور ترکی ٹوپی کو بہ طور یونی فارم
رواج دیا جائے مولانا شبلی نے بھی قسطنطنیہ سے ایک خط میں تائید کی کہ

"یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی ہر کالج کا خاص لباس ہے
اور کوٹ پر گریبان کے قریب ہر کالج کا نام لکھا ہوتا ہے مجھ کو یہ بات بہت
پسند ہوئی ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا سید صاحب
قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہو"
(خط ۵ر جون ۱۸۹۲ء موسومہ شیخ حبیب اللہ)

اگرچہ یہ لباس کالج میں بہ طور یونی فارم لازم نہیں ہوا مگر چند طلبا ترکی کوٹ
ترکی ٹوپی اور بوٹ استعمال کرتے تھے بعض انگریزوں کو یہ ناگوار تھا سرسید نے
اس ناگواری کو محسوس کر کے دو تین طلبا کے لیے اپنے پاس سے بطور یونی فارم
لباس تیار کرایا اور طلبا اور اسٹاف کے سامنے ایک تقریب کا انتظام کیا ۲ر دسمبر
سنہ ۱۸۹۱ء کو وہ اپنے ساتھ وہی لباس پہنا کر جلسے میں لے گئے اور کالج لائف پر
ایک زبردست تقریر کی اور اس میں نماز باجماعت کی اہمیت اور لباس کی
یکسانی وغیرہ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ" جو لباس اب تمھارا ہے یعنی ٹرکش ٹوپی
اور کوٹ اور انگلش بوٹ یہ نہایت عمدہ ہے صرف اتنی بات ہے کہ تمھارے کوٹ

مختلف رنگ کے ہیں پس سب کو ایک وضع اور ایک رنگ کے کوٹ اختیار کرنے چاہئیں ...... ہندستان میں بعض کوتاہ نظر یا مغرور اور کم بیں انگریز جو ہندستانیوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایسے ہیں جو ٹوپی، کوٹ اور بوٹ پہنے ہوئے جانے پر اعتراض کرتے ہیں مگر تمام اعلیٰ حکام اور عالی خاندان انگریز اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے .... جو انگریز ان باتوں میں تکرار کرتے ہیں میرے یقین میں وہ اس امر کے ماسٹر ہیں کہ کبھی ہندستانیوں اور انگریزوں میں دوستی ومحبت اور اخلاص کا برتاؤ نہ ہو، باوجود ان کوششوں کے جو میں نے مسلمانوں اور انگریزوں میں دوستی اور اتحاد پیدا ہونے کی کی ہیں میں ایسے انگریزوں سے جو ان باتوں میں کاوشش کرتا ہو میں خود کبھی اس سے نہیں ملتا اور دوستی کرنا نہیں چاہتا۔" (صفحہ ۵۲۸ مجموعہ)

کالج میں جو طریقہ معاشرت تھا مولانا شبلی بھی نہ صرف اس کے نامی تھے بلکہ وہ اس کو بھی ناپسند کرتے کہ غریب طلبا اور امیر وخوش حال طلبا میں کوئی امتیاز نمایاں ہو چناں چہ قسطنطنیہ کے کالجوں کے بورڈنگ ہاؤسوں کو دیکھ کر وہ اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ

"تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں اور ان میں نہایت کثرت سے طلبا رہتے ہیں لیکن یہ التزام ہے کہ خوراک لباس وضع مکان فرنیچر تمام چیزیں ایک سی ہوں اور طالب علموں کی حالت میں فرق مراتب کا کوئی شائبہ نہ ہو بورڈنگ ہاؤس کا کرایہ اور خوراک کی جو فیس لی جاتی ہے اس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لیے جاتے ہیں اور طالب علموں کے کپڑے خود کالج کے اہتمام سے تیار ہوتے ہیں۔ تمام لڑکے میز اور کرسیوں پر کھاتے ہیں اور ہر چیز میں تکلف، صفائی خوش سلیقگی کا

نہایت اہتمام کیا جاتا ہے۔

ترکوں کی یہ عجیب قابلِ قدر فیاضی ہے کہ وہ باوجود زیادتی فیس کے غربا ان کالجوں کے فیض سے محروم نہیں ہیں، ہر کالج میں غریبوں کی معتدبہ تعداد ہے اور دولت مند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں ...... اس کا اثر یہ ہے کہ کالج کے احاطے میں جا کر کوئی شخص کسی طرح یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے طالب علموں کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے اور غربا کو اعلیٰ درجے کی معاشرت کا حاصل ہونا ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری کا مادہ پیدا کرتا ہے"......

"بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھے اپنا مدرستہ العلوم یاد آتا تھا اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر افسوس کرتا تھا لیکن میرا افسوس درحقیقت مدرستہ العلوم کی حالت پر نہ تھا بلکہ قوم کے ان بزرگوں پر تھا جن کو خدا نے دولت اور مقدور دیا ہے لیکن یہ توفیق نہیں دی کہ اپنی فیاضی سے اس بات کی کوشش کریں کہ ہماری تعلیم گاہ میں غربا اور اہلِ مقدرت ایک ہی بلند سطح پر نظر آئیں میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری اور نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس وضع خوراک، مکان فرنیچر کلیتہً ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں بالکل مٹا دی جائیں، اگر یہ نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں" (صفحہ ۴۹ و ۵۰ طبع ثانی)

اب تیسری بات کہ نقالی کی وجہ سے ایثار اور قومی خدمت انجام نہ دے سکے

تو پہلے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہزار دو ہزار آدمیوں میں نفسے چند ہی ایثار کرتے اور قومی خدمت انجام دیتے ہیں تاہم سرسید کے عہد اول کے بہت سے طلبا نے زبردست ایثار کئے اور قومی خدمات انجام دیں سب کا احاطہ تو ناممکن ہے چند نام بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔ خواجہ سجاد حسین بی۔اے علاوہ دیگر خدمتوں کے باوجود کبرسنی ایک عمدہ ہائی اسکول پانی پت میں چلا رہے ہیں انہی کی کوشش سے اس کی عمارات تیار ہوئیں اور اس نے مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کی سید عبدالنبانی ایم۔اے اور میر ولایت حسین بی۔اے نے باوجود دیگر اچھے مواقع ملنے کے کالج کی خدمت کو ترجیح دی اور آخرالذکر سبک دوشی کے بعد ۲۵ سال سے تعلیمی خدمات میں مصروف ہیں۔

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم بار ایٹ لا اور خان بہادر شیخ عبداللہ ایڈوکیٹ نے قانون پیشہ ہونے پر بھی سال کانفرنس کالج اور یونی ورسٹی کی خدمات میں اپنے وقت کا بڑا حصہ صرف کیا جو اگر پیشہ کے کاموں میں صرف ہوتا تو ہزاروں کی آمدنی ہوتی اور دونوں ہائی کورٹ کی ججی تک پہنچ جاتے کانفرنس کا استحکام اور زنانہ ڈگری کالج ان دونوں کی بڑا ایثار خدمات کی زندہ یادگاریں ہیں ڈاکٹر مولوی عبدالحق بی۔اے ۴۲ سال سے اردو کی جو خدمت کر رہے ہیں اور جن کے انہماک و ایثار نے انجمن ترقی اردو کو ایک کل ہند ادارہ بنا دیا ہے اور جس نے ملک میں ایک عظمت حاصل کر لی ہے انھوں نے نہ صرف دماغی و جسمانی محنت کی بلکہ اپنی عمر بھر کا اندوختہ اور اپنا ذاتی نادر کتب خانہ بھی وقف کر دیا، ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد کی پنجاہ سالہ خدمات سورج کی طرح روشن ہیں انھوں نے ہندستان اور یورپ کی تعلیم سے فارغ ہو کر مستقبل کی بڑی بڑی امیدوں کو قومی کالج کی خدمت پر نثار کر دیا۔ مولانا شوکت علی مولانا محمد علی مولانا ظفر علی خاں

سیٹھ یعقوب حسن (مدراس) کی سیاسی خدمات اور ان خدمات میں سخت ترین مصائب کا تحمل تو عالم آشکارا ہے، مولوی حاجی محمد حبیب اللہ خاں نے نہ صرف اپنی کوٹھی قیمتی ۲۵-۳۰ ہزار کی وظائف کے لیے وقف کی بلکہ اپنی عمر میں جو راحت و آرام کی ہر دو رہ کر کے اولڈ بوائز سے آفتاب ہاسٹل کے لیے روپیہ جمع کیا اور سوا لاکھ روپیہ قیمت کا ہاسٹل تعمیر کرا دیا جس کی آمدنی غریب بچوں کے وظائف کے لیے مخصوص ہے حاجی سر عبدالرؤف بار ایٹ لا اور صاحب زادہ سر سلطان احمد خاں نے پچاس پچاس ہزار روپیہ اپنی کمائی سے یونی ورسٹی کو عطیہ دیا اور آخر الذکر نے تو نہ صرف مسلم یونی ورسٹی بلکہ دہلی یونی ورسٹی، بنارس یونی ورسٹی، حالی اسکول اور دیگر امور خیر میں تقریباً ایک لاکھ روپیہ اور دیا۔ یہ چند مثالیں غالباً ایسے معترضین کا کافی جواب ہیں۔

• سر و سامان کی گرانی یا تکلفات کی فراوانی حاکم قوم کی نقالی پر ہی منحصر نہیں بہ دولت اور طبیعت پر منحصر ہوتی ہے قریب زمانے کے ایک نہایت مقدس عالم مولوی رشید احمد صاحب کے گھر کا منظر ایک نہایت محترم عالم مولوی عبدالحی صاحب ناظم ندوہ نے معارف (اعظم گڑھ جلد ۲۲) میں یہ دکھایا ہے کہ

"مولوی صاحب کے لباس و مکان میں بہت تجمل ہے سب چیزیں آراستہ و قرینے سے رکھی ہوئی ہیں دو دو دیوار گھڑی، قالین کی جانماز، اونی چوتہی چوپرت بچھی ہوئی چھوٹے چھوٹے تکیے رکھے ہوئے ایک عمدہ پلنگڑی اس پر گدے پر گدہ سفید چاندنی دلائی نہایت عمدہ الماری میں قرینے سے کتابیں چنی ہوئی، چٹائی کا کمرہ میں فرش نہایت صاف و شفاف .... مولوی صاحب کے صاحب زادے بھی آئے ایک صوف کا سیاہ جبہ اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور دوسرے انگرکھے کے اوپر ایک فاختئی رنگ کا بانات کا کوٹ پہنے ہوئے جس کے اطراف طلائی لیس

دو انگل ٹکی ہوئی اور لیس کے اوپر انگریزی کلابتو کا نہایت عمدہ کام اور آستینوں پر ترنج بنے ہوئے "

خود مولانا شبلی اگرچہ لباس مولویانہ پہنتے تھے لیکن مخصوص موقعوں کے لیے وہ بہت قیمتی ہوتا اعظم گڑھ میں سکونت کے لیے بنگلہ تھا میز و کرسی تھی، اور مصنف حیاتِ شبلی کے ہی الفاظ میں "کھانے میں ہاتھ بہت کم آلودہ کرتے ان کے دسترخوان پر چمچہ بلکہ چھُری کانٹا بھی ہوتا اور اسی سے بوٹیاں اور ترکاریاں وغیرہ کھاتے (۵۷)

آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا قصہ یہ ہے کہ جب تہذیب الاخلاق[۳] سہ بارہ جاری ہوا ہے تو سرسید نے ایک طویل اور تاریخی مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "اگلے زمانے میں علومِ دینیہ اور علومِ عربیہ و فلسفۂ یونانیہ کی ترقی کس وجہ سے تھی اور اب کیوں تنزل ہو گیا ہے، اُس کے آخر میں لکھتے ہیں کہ

"بعض علما مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ نئی روشنی والوں یعنی انگریزی خوانوں اور ان کے حامیوں کو آگے بڑھ جانے دو اگر تم دینی و مذہبی ترقی چاہتے ہو تو پیچھے ہٹو اور پچھلے لوگوں سے ملو اور یہاں تک پیچھے ہٹو کہ ہٹتے ہٹتے صحابہ اور نبی آخر الزماںؐ سے جا ملو، ای حضرات! پیچھے ہٹنا تو آسان ہے مگر صحابہ اور رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم تک جا ملنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے مجھ کو خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے گڑھے میں جا پڑو" لاتکم علیٰ شفا حُفرۃ " پھر ہم عاجزی سے کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانے تک پہنچنا تو دشوار ہے مگر برائے خدا پیچھے ہٹنے کی نصیحت نہ فرمائیے جس جگہ مسلمان تھے اسی جگہ ٹھیرے رہنے نے تو مسلمانوں کو اور مسلمانی سلطنتوں کو برباد اور قوم اسلام کو ذلیل و خوار کر دیا، دُنیا میں جہاں مسلمان ہیں ایک ہی حالت میں ہیں پھر

ان کو پیچھے ہٹا کر کیا کیجیے گا کیا ان کو معدوم کر دینے کا ارادہ ہے خدا نہ کرے ......جو علما (اور وہ غالباً حنفی ہیں) نصیحت کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علوم جدیدہ میں ترقی کرنے سے مسلمانوں کے ایمان میں خلل آتا ہے ان کو یاد رکھنا چاہیے اور نہیں بھولنا چاہیے کہ الایمان لایزید ولاینقص اور ان کو سوچنا چاہیے اور نہایت راست بازی سے کہنا چاہیے کہ اسلام میں اور دُنیوی عزت حاصل کرنے میں کوئی تناقص نہیں ہے اور اب بجائے اس کے کہ وہ پکارتے ہیں کہ زمانے کے رخ کے برخلاف حرکت کرو مسلمانوں کو یہ سچی نصیحت کرنی چاہیے کہ در مع الدھر کیف ادار۔

اس مضمون میں نہ مولانا شبلی کا نام ہے نہ ان کی طرف کوئی اشارہ ہے نہ ندوہ کے جلسے یا اور کسی جلسے کا ذکر ہے معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف نے بھی اصل تقریر کو نہیں دیکھا سنی سنائی بات لکھ دی، پھر اس مضمون میں کسی ایک عالم کے قول پر بحث نہیں بلکہ دونوں موقعوں پر بعض علما کا لفظ ہے، خود مولانا شبلی جو علما کے لیے بھی آگے بڑھنا اور علوم جدیدہ کی تحصیل ضروری جانتے تھے ایسی نصیحت کسی طرح نہیں کر سکتے تھے اور لو فرضنا ان بعض علما میں وہ بھی ایک تھے تو سرسید کو غصہ آنے کی کوئی وجہ نہ تھی، ان کو تو بڑے بڑے اختلافات کے موقع پر بھی غصہ نہیں آیا اور اس مضمون میں تو غصے کی کوئی جھلک بھی نہیں ہے۔

ساتویں شعاع ملاحظہ ہو:

"خود سرسید کی سوانح عمری کے لکھنے کا مسئلہ بھی ایک اختلافی مسئلہ بن گیا تھا آخر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں کیوں کہ وہ پاس رہتے تھے مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے چناں اس بارے میں جتنی بالواسطہ تحریکیں

کی گئیں اُن کو مولانا بہ لطائف الحیل ٹالتے گئے اسی اثنا میں سرسید کے نام نواب آسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاؤلی (علی گڑھ) کا ایک خط مکہ معظمہ سے آیا کہ انھوں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی شبلی آپ کی لائف لکھ رہے ہیں مولانا کو یہ خط دکھایا گیا مگر اس مقدس خواب کی تعبیر بھی صحیح نہیں نکلی اس کے بعد سرسید مرحوم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولانا کو بلا کر اپنے کچھ حالات نوٹ کراتے رہے مولانا اس کو بجنسہٖ لکھتے رہے جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو یہ قرعہ فال مولانا حالی مرحوم کے نام نکلا اور انھوں نے ۱۸۹۸ء سے اس کو انجام دینا شروع کیا" (۲۹۱-۲۹۲)

لیکن مولانا حالی حیاتِ جاوید کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ

"راقم کو سرسید کی زندگی کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اس وقت پیدا ہوا جب کہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بنیاد ڈال چکے تھے" اسی وقت سے میں نے کچھ نوٹ ان کی لائف کے متعلق قلم بند کرنے شروع کیے اور کم و بیش سو سوال ایک کاپی میں لکھ کر سرسید کے پاس بہ مقام علی گڑھ اس غرض سے بھیجے کہ ان کے جواب مختصر طور پر لکھ دیں مگر وہ کاپی ان کے پاس یوں ہی پڑی رہی کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ ملا میں نے یہ بھی چاہا کہ برس چھ مہینے خود علی گڑھ جا کر رہوں جہاں اس کے لیے قیام کرنا نہایت ضروری تھا مگر ملازمت کے تعلق کی وجہ سے یہ موقع بھی نہ مل سکا بعض صاحبوں کی رائے یہ ہوئی کہ سرسید کی زندگی میں ان کی لائف لکھنی مناسب نہیں اس کے جو وجوہات انھوں نے اس وقت بیان کیں وہ مجھے بھی معقول معلوم ہوئیں ان اسباب سے آخر کار یہ ارادہ موقوف کر دیا گیا کچھ دنوں کے بعد سرسید کے نہایت خالص مخلص دوست آنریبل حاجی آسمٰعیل خاں رئیس

دنیا والوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معزز لائف جہاں تک ممکن ہو اُردو زبان میں مکمل طور پر لکھی جائے چنانچہ ان کی تحریک سے منشی سراج الدین احمد مالک و مہتمم چودھویں صدی سرسید کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے انھوں نے بڑی کوشش سے ان کے لیے میٹریل جمع کیا اور ایک خاص حد تک اس کو ترتیب دے کر حاجی صاحب کو دے دیا وہ مسودہ رکھا رہا مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی چوں کہ کرنل گراہم اور منشی سراج الدین سرسید کی زندگی میں ہی ان کی لائف لکھنے کی راہ نکال چکے تھے میرے دل میں پھر ایک ولولہ اٹھا...... چناں چہ ۱۸۹۵ء میں اسی غرض سے میں نے چند ماہ علی گڑھ میں قیام کیا جہاں خود سرسید اور ان کی لائف لکھنے کا سامان موجود تھا اور اس کے بعد کئی دفعہ اس کام کے لیے وہاں جا جا کر ٹھیرا...... اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید کی لائف اگر ان کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو وہ عظمت جس کی وہ مستحق تھی اس کو حاصل ہوتی دشوار تھی مگر ایک خاص وجہ سے ہم کو افسوس کہ وہ سرسید کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ اوّل اوّل تو جب کبھی سرسید کے سامنے ان کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں کنکوے اُڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے۔ مگر آخر میں جیسا کہ عام طبائع انسانی کا خاصہ ہے ان کو اس بات کے دریافت کرنے کا زیادہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی اخیر بایوگرافی میں کیا لکھا جا رہا ہے اور اسی لیے وہ اپنی لائف کے جلد شائع ہونے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے چالیس برس مذہب کی حمایت میں بسر کیے ہوں اور سوائے تکفیر و تذلیل کے قوم کی طرف سے کچھ انعام نہ پایا ہو اُس سے زیادہ کون شخص اس بات کے

دیکھنے کا خواہش مند ہوسکتا ہو کہ کوئی مسلمان اس کی تصنیفات پر بہ نظرِ انصاف بحث کرے"۔

نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں کے خط (از مقام مکۂ معظمہ) پہ ان کے ہی اس بیان سے روشنی پڑتی ہو جو انھوں نے سرسید کی لائف کے متعلق انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۳ رجون سنہ ۱۸۹۰ء میں لکھا ہو کہ ان کو عرصے سے سرسیّد کی لائف لکھے جانے کی دُھن تھی سرسیّد نے ہرچند ان کو روکا وہ نہ مانے اور انھوں نے اولاً مولوی محمد شبلی نعمانی سے درخواست کی اگرچہ انھوں نے آرے بٹے کی مگر کچھ کیا نہیں" اب یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ کرنل گرہیم نے سنہ ۱۸۸۵ء میں سرسید کی لائف شائع کی تھی اور مولانا حاؔلی سنہ ۱۸۷۷ء کے بعد ہی جب کہ اس بڑے کام کی بنیاد پڑ چکی تھی ارادہ کر چکے تھے اور سرسید کو اُن کے ارادے کا علم بھی ہو چکا تھا، ملک میں ان کی کافی شہرت علمی وقعت اور تصنیفی عظمت قائم ہو چکی تھی اور مولانا شبلی سنہ ۱۸۹۰ء تک صرف کانفرنس کے پلیٹ فارم پر متعارف اور ایک ہی مستقل تصنیف المامون سے علمی حلقوں میں روشناس ہوئے تھے تو مولانا حالی جن کی خود سرسیّد کے دل میں کمال عظمت تھی ان کے مخلصانہ اصرار کو نظر انداز کر کے ان ترکیبوں سے مولانا شبلی ہی سے کیوں اصرار کرتے، مولانا حاؔلی نے حیات جاوید کے ماخذ بھی بیان کیے ہیں اور یہ بھی لکھا ہو کہ "خاندان بچپن اور تعلیم کے حالات خود سرسیّد کی زبانی لکھے گئے"۔ اگر مولانا شبلی سے سرسیّد حالات نوٹ کراتے رہے تو وہ بھی سوانح نگار کو حوالہ کر دیے جاتے اور مولانا حاؔلی اس کا بھی ذکر کرتے۔

آخر بائیو گرفی میں جو حالات لکھے جا رہے تھے اُن کے معلوم ہونے کے خیال کی نسبت مولوی وحید الدین تیلم معارف (علی گڑھ) جون سنہ ۱۹۰۱ء میں بسلسلۂ تبصرہ حیاتِ جاوید لکھتے ہیں کہ "راقم نے سرسیّد کی زندگی کے اخیر پانچ سال ان کی صحبت و رفاقت میں بسر کیے ہیں یہ ہی وہ زمانہ ہو جب کہ مولانا لائف لکھنے میں مشغول تھے اور اس زمانے میں وہ کبھی کبھی علی گڑھ میں اور زیادہ تر پانی پت میں مقیم رہتے تھے وہ اکثر اپنی

عنایت و مہربانی سے لائف کے دوسرے حصے میں سے بعض بعض مضامین و حالات راقم کو سنا دیا کرتے تھے اور راقم کے حافظے میں ان مضامین کا جو دھندلا سا خاکہ باقی رہتا تھا اس کو راقم سرسید کی خدمت میں ان کے استفسار پر بیان کر دیا کرتا تھا، وفات کے وقت کبھی انھوں نے یہ دریافت نہیں کیا کہ ان کے حالات کیا اور کس طریقے سے لکھے جا رہے ہیں نہ راقم نے کبھی اس امر کو بیان کیا البتہ ان کی مذہبی تصنیفات یا مذہبی خدمات کی نسبت جو کچھ مولانا نے لکھا اس کا ذکر ضرور آجاتا تھا جب راقم نے بیان کیا کہ مولانا نے آپ کے تمام کاموں کا محرک اور آپ کی ترقی کا باعث مذہب کو ٹھیرایا ہے اور بیان کیا ہے کہ ایشیا میں کوئی بڑا کام کسی شخص سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مذہب کا پابند نہ ہو تو انھوں نے مسکرا کر فرمایا کہ بے شک میں نے جو کچھ کیا ہے اس کا محرک مذہب ہی تھا اور یہی چیز ہے جو سخت سے سخت محنت کو خوش گوار بنا دیتی ہے۔ غالباً ہمارے بیان سے مولانا کے اس بیان کی کافی تصدیق ہو جائے گی کہ وہ صرف اس بات کے دیکھنے کے خواہش مند تھے کہ ان کی مذہبی خدمات کی نسبت کیا لکھا جاتا ہے کسی اور بات کے دریافت کرنے کی ان کو مطلق خواہش نہ تھی۔"

• اسی لائف کے سلسلے میں آگے چل کر مصنف حیاتِ شبلی کہتے ہیں کہ

"یہی سبب ہے کہ سرسید کی وفات پر اُن کی زندگی کے کارناموں پر جب مختلف مضامین کا لکھا جانا طے ہوا اور اس سلسلے میں "سرسید اور مذہب" کا عنوان مولانا شبلی کے لیے تجویز ہوا تو انھوں نے اس سے انکار کیا آخر لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر سرسید اور اُردو لٹریچر کا دوسرا عنوان لیا اور پہلے مضمون پر مولانا حالی نے لکھا۔"

اس فقرے میں جو لفظ اصرار ہے اس پر حاشیہ ہے کہ " اس اصرار کی تصریح مولانا نے خود اس مضمون میں کی ہے، پہلے مضمون کی تجویز اور انکار کے متعلق کوئی زبانی

یا تحریری حوالہ نہیں، البتہ اصرار کی طرف تصریح کا اشارہ ہے، اب اس تصریح کو بھی پڑھنا چاہیے مولانا شبلی آخرِ مضمون میں لکھتے ہیں کہ

"حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد نے اُردُو انشا پردازی پر جو اثر ڈالا ہے اس کی تفصیل کے لیے دُو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ لکھ چکے ہوں گے اور خوب لکھا ہوگا۔"

میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا کہ اس وقت جب کہ تمام ملک میں سرسید کا آوازۂ ماتم گونج رہا ہے اور ہر شخص اُن کے کارناموں کے سننے کا مشتاق ہے کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہیے میں نے اس کی تعمیل کی ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا ؎

بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل   اُٹھا چکے ہیں زمیں دار جن زمینوں کو"

اب ناظرین خود مصنفِ حیاتِ شبلی کی سخن فہمی اور "انکار و اصرار و مجبوری" کی معنی آفرینی کی نسبت فیصلہ کر لیں۔

واقعہ یہ ہے کہ پہلا عنوان سرسیّد کی زندگی کا سب سے بسیط اور اہم مضمون ہے اور وہ سب کالج والے جنھوں نے مولانا شبلی سے مختصر طور پر مضمون لکھنے کی خواہش کی تھی جانتے تھے کہ لائف لکھی گئی ہے اور مولانا حالی نے اس کو لکھا ہے لہٰذا مولانا شبلی سے ایسی درخواست نہ صرف بے موقع تھی بلکہ مولانا حالی کی توہین تھی، مولانا حالی نے اس مضمون پر برسوں غور کیا تھا اور لکھ چکے تھے ان کے لیے بالاختصار لکھنا کسی دُوسرے کے مقابلے میں آسان تھا اور انھوں نے ہی لکھا اور اس کی تمہید میں جتا دیا کہ

"سرسید کی لائف میں من جملہ ان مختلف حیثیتوں کے جو اُن کی ذات میں جمع تھیں

سب سے زیادہ لحاظ کے قابل بلکہ ان کی تمام لائف کی جان مذہبی حیثیت ہے جس
بیان کی لائف میں جو عنقریب شائع ہونے والی ہے ہر ایک پہلو سے نظر
ڈالی گئی ہے۔"

مولانا شبلی نے شعر العجم کے سلسلے میں بھی اسی طرح کا ایک فقرہ لکھا ہے جس کو
مصنف حیاتِ شبلی نے بھی تمہید کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔

"شعر العجم حصّۂ دوم میں سعدی کے حالات لکھنے میں اس لیے پس و پیش کرتے
تھے کہ حالی کے بعد اس میں کیا اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن مجبوراً سعدی کے حالات
لکھے تو اس کے ساتھ یہ حاشیہ لکھا" مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے
حیاتِ سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے اس کے
بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار
کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔ (۸۰۲)

اسی طرح سر سید کے متعلق بھی سمجھنا چاہیے تھا۔

آٹھویں شعارع "عربی تعلیم کی ترقی اور اصلاح کا مسئلہ دوسرا باب ہے جس میں دونوں
کو اختلاف تھا، سر سید جدید انگریزی تعلیم کے علاوہ ہر ایسی تعلیم کے شیوع کو
جو اُن کو اُدھر سے ہٹائے مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے[1]..... بہر حال
ان کو مشرقی علوم اور عربی تعلیم سے اس لیے دلچسپی نہ تھی کہ وہ مسلمانوں
کو آگے بڑھنے سے روکیں گے مولانا کا عقیدہ تھا کہ اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم
نہ رہی تو پھر مسلمان مسلمان رہیں گے کہاں جن کی ترقی کے لیے یہ جد و جہد
ہو رہی ہے" (۲۹۲)

اس کے بعد ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلما قائم ہونے اور مولانا کی زندگی کا مقصد بننے کا ذکر

---

[1] یہاں پنجاب اور الہ آباد دو یونی ورسٹیوں میں مشرقی تعلیم کی مخالفت کا ذکر ہے۔

کر کے لکھا ہے کہ کالج میں "مولانا کی زندگی کا یہ رُخ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا شاید ۱۸۹۲ء میں جب مولانا کو حیدرآباد سے وظیفہ ملا ہے تو فطرتاً ان کو خوشی ہوئی کہ اب وہ کالج کے حلقے سے آزاد ہو کر اپنے مذاق کا کام کریں گے۔ اسی جذبے میں انھوں نے ایک فارسی قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ ادب، طلب اور ردیف "است" تھی اس میں ایک مصرع تھا ع زیں سپس نزوہ وتدریس علوم عرب است یہ قصیدہ کالج کے احاطے میں قابلِ اعتراض ٹھیرا اور مولوی سید علی بلگرامی کے مشورے سے مولانا نے اس کو نہ شائع کر دیا" ۲۹۳

اب یہ روشنی میں واقعات کو دیکھیے ۱۸۸۶ء میں سرسید نے کانفرنس کے جو مقاصد قرار دیے ان میں (حرف ج) یہ مقصد بھی تھا کہ "جو لوگ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم قدیم طریقے پر ہماری قوم کے علما سے پاتے ہیں اور اس کو انھوں نے اپنا مقصد قرار دیا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں اس تعلیم کے قائم رہنے اور جاری رہنے کی مناسب تدابیر عمل میں لانا" کانفرنس کے اولین اجلاس ہی میں یہ رزولیوشن بہ تحریک مولانا شبلی اور بہ تائید سرسید پاس ہوا کہ اس جلسے کی رائے میں مسلمانوں کو یورپین سائنس و لٹریچر کی اعلیٰ درجے کی تعلیم کی شدید ضرورت ہے قوم اور گورنمنٹ دونوں کو اس پر توجہ چاہیے انگریزی کالجوں میں مشرقی زبانوں کا بطور سکنڈ لینگویج کے رہنا کافی ہے، خاص مشرقی علوم کی نسبت ہم کو گورنمنٹ کی توجہ درکار نہیں ہے وہ جس طرح کہ ہمارے قدیم طریقے پر ہماری قوم کے عالموں کے ذریعے سے ہوتی تھی اس کو اسی طرح رہنا چاہیے اور خود ہماری قوم کو اس کے باقی رہنے پر ایسے لوگوں میں جو اس کی خواہش رکھتے ہیں توجہ رکھنا لازم ہے، مشرقی علوم جو مسلمانوں میں قدیم سے اب تک رائج ہیں وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل سے ایسے مخلوط ہیں کہ جدا نہیں ہو سکتے اور اس گورنمنٹ کو اس کا اختیار کرنا مناسب نہیں

اور اگر مذہبی مسائل کو اس سے خارج رکھا جائے تو کوئی شخص جو مشرقی علوم کا خواہاں ہو اس کو پسند نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے اس کو اختیار کرے گا تو مسلمانوں کمیونیٹیوں میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی۔"

سنہ ۸۷ - ۱۸۸۸ء میں ایک دوسرے رزولیوشن کے مطابق جو تعلیمی سروے ہوئی اس میں ایسے مدارس کا جہاں عربی تعلیم ہوتی تھی اور ایسے علما کا جو ان مدرسوں میں یا اپنے گھروں پر پڑھاتے تھے تفصیلی تذکرہ تھا۔ (رپورٹ کانفرنس) ۱۸۸۹ء میں سرسید نے نواب عماد الملک کو لکھا تھا کہ "اسی کے ساتھ میں یہ تدبیر چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درس کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جاتا ہے کسی طرح قائم رہے اگر عربی فارسی ہم میں سے معدوم ہو جائے تو اسی کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے گی۔" (مجموعہ خطوط سرسید)

۱۸۷۶ء میں خود مدرستہ العلوم (ایم-اے-او کالج) میں صیغہ علوم مشرقی قائم کیا گیا علوم ادبیہ اور دینیہ کی تعلیم کا خاص نصاب بنایا گیا ترغیب کے لیے وظائف اور میڈل مقرر کیے گئے مگر یہ حصہ ہمیشہ تعداد طلبا کے لحاظ سے ضعف کی حالت میں رہا اور مجبوراً ۱۸۸۵ء میں بند کرنا پڑا۔ باوجود اس ناکام تجربے کے ۱۸۹۲ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ اگر کالج کے طلبا آمادہ ہوں کہ بی-اے کی ڈگری لینے کے بعد فقہ و تفسیر و حدیث پڑھیں اور مناسب تعداد ہو تو فی الفور اس کا بندوبست کیا جائے گا۔

۱۸۹۳ء میں کانفرنس میں یہ تجویز پاس کی گئی کہ گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں عربی کو بطور زبانِ ثانوی لینے کے لیے وظائف مقرر کیے جائیں۔

اب ندوہ اور سرسید کا تعلق بھی سنیے۔ سرسید کو ندوہ کے جلسے کی اطلاع بہ حیثیت ایڈیٹر انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے کی گئی تو سرسید نے ایک نہایت حوصلہ افزا

جواب لکھا اغراضِ ندوہ کی تعریف کی اور نہایت زوردار پیرائے میں جدید علم کلام کی تدوین پر توجہ دلائی۔ اس کا آخر فقرہ تھا کہ

"جو مسائل حکمت و فلسفہ طبیعات کے علوم جدیدہ کے ذریعے سے پیدا ہوئے ہیں ان کے لیے وہ علم کلام جو یونانی فلسفہ وحکمت کے مقابل بنایا گیا تھا کافی نہیں ہے اور تفاسیر قرآن مجید اور تفاسیر حدیث شریف اور دیگر کتب مصنفہ اہل اسلام میں اس کے متعلق کچھ پایا نہیں جاتا اور اس سبب سے الحاق و زندقہ مسلمانوں میں پھیلتا جاتا ہے جو نہایت سخت وبا ہے جس کی روز بہ روز ترقی ہونے کی امید قوی ہے پس اس کا کیا علاج ہے امید ہے کہ آپ میرے اس عریضے کو ندوۃ العلما کے سامنے پیش فرمادیں گے اور جو ہدایت علما کی اس باب میں ہو اُس کو مشتہر فرمادیں گے تاکہ مسلمان اس آفت سے جس کی پناہ کسی جگہ نہیں معلوم ہوتی محفوظ رہیں۔"

(مجموعہ لیکچرز سرسید)

اس خط کے بعد جب ندوۃ العلما کی روداد کا حصّہ اوّل بغرض ریویو موصول ہوا تو سرسید نے لکھا کہ "اس پر ریویو لکھنا اور فرائض ریویو نویسی کو پورا کرنا کس قدر مشکل اور نامناسب ہے ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے اس کو چلنے دینا چاہیے۔ خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے میں اس کی رسید اخبار میں چھاپوں گا اور نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی کانفرنس کے اجلاس میں ریزولیشن پیش کریں گے اور جو آپ کا ارشاد ہو اس پیرائے میں اس کی تعمیل ہو جائے گی اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں کہ باہم علما کے اتفاق ہو الّا کوشش ضرور ہو۔"

اس کے بعد ہی دسمبر ۱۸۹۴ء میں نواب محسن الملک نے یہ رزولیوشن پیش کیا

"اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جلسہ ندوۃ العلما جو بہ مقام کانپور منعقد ہوا

تھا اور جس میں علما اور اکابر دین جمع ہوئے تھے عام مسلمانوں کی توجہ کے لائق ہے اور اس کے مقاصد یعنی اصلاح طریقۂ تعلیم و رفع نزاع باہمی نہایت عمدہ اور مفید ہیں تمام مسلمانوں کو ایسی عمدہ اور مفید مجلس کی جس سے مسلمانوں کی دینی و دنیوی بہبودی مقصود ہے بہ دل وجان قلم سے قدم سے درم سے مدد کرنی چاہیے۔"

نواب محسن الملک کی یہ تقریر ان کی معرکہ کی تقریروں میں سے ہے سید محمود نے اس رزولیوشن کی تائید کی ان کی اردو تقریریں بہت کم ہیں تاہم یہ ایک ہی تقریر ہزاروں پر بھاری ہے، انھوں نے اور باتوں کے علاوہ ماہر قانون کی حیثیت سے بھی اس کے فائدوں پر روشنی ڈالی۔ پھر کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۴ء میں ایک رزولیوشن پیش ہوا کہ اوقاف کے روپیہ سے انگریزی تعلیم کو مدد دی جائے تو سرسید نے سخت اختلاف کیا کہ جو اوقاف عربی تعلیم کے لیے ہیں ان سے عربی تعلیم ہی جاری رکھی جائے ۱۸۹۵ء میں دارالعلوم ندوہ کے قائم کیے جانے کی تائید کی گئی۔

اب مشرقی تعلیم کی نسبت مولانا شبلی کی رائیں بھی ملاحظہ ہوں۔ مولوی حمیدالدین کو فروری ۱۹۰۲ء میں لکھتے ہیں کہ

"خط سے معلوم ہوا کہ عربی عبارت لکھی ہے داؤد بھائی کے پاس بھیجتے ہو اس قسم کے جہلات کام کرو گے عربی عبارت لکھ کر اپنا دل خوش کرو گے کہ دوسرا حریری پیدا ہوا اچھا پھر نتیجہ کیا؟ مسلمانوں کو آج کل حریری اور امراء القیس کی ضرورت ہے۔" (مکاتیب حصہ دوم صفحہ ۱۱)

علاوہ ازیں ایک اور رائے بھی ملاحظے کے قابل ہے جو انھوں نے مشرقی کانفرنس ۱۹۱۱ء کے سلسلے میں ظاہر کی ہے۔

"مشرقی تعلیم کی تحریکیں اس سے پہلے بھی ہوئیں ڈاکٹر لائیٹنر کی سرگرم

کوششوں سے پنجاب میں تعلیم مشرقی کی ایک شاخ یونی ورسٹی میں قائم ہوئی
الہ آباد یونی ورسٹی میں مُلا اور فاضل کے امتحانات اسی خیال کے نا تمام خاکے
ہیں، سرسید مرحوم نے ہمیشہ اِن کوششوں کی سخت مخالفت کی پنجاب یونی ورسٹی
پر اُن کے تین پُر زور آرٹیکل قلعہ شکن توپیں تھیں جن کے صدمے نے مشرقی تعلیم
کو چکنا چور کر دیا الہ آباد یونی ورسٹی جب بن رہی تھی اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اس
میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھولی جائے گی تو سرسید نے متعدد آرٹیکل اس زور
کے لکھے کہ اس تجویز کے پرخچے اُڑ گئے، سرسید کی مخالفت اس پر مبنی تھی کہ وہ
سمجھتے تھے کہ مشرقی تعلیم کی یہ کوشش مغربی تعلیم کی ترقی کو روک دے گی جو
ملک کے لیے نہایت ضرر رساں کام ہو اس میں ایک ذرہ شبہ نہیں کہ اگر ہم کو یہ
یقین ہو کہ مشرقی تعلیم کی کسی تجویز سے مغربی تعلیم میں ایک ذرہ بھر بھی کمی ہوگی
تو ہمارا فرض ہو کہ اس تجویز سے علانیہ نفرت کا اظہار کریں مسلمان اس وقت
کش مکش زندگی کے میدان میں ہیں ان کی ہم سایہ قومیں مغربی تعلیم ہی کی بدولت
ان سے اس میدان میں بڑھ رہی ہیں اگر خدانخواستہ مسلمان مغربی تعلیم میں ذرا
بھی پیچھے رہ جائیں تو ان کی ملکی اور قومی زندگی دفعتاً برباد ہو جائے گی لیکن
اب وہ حالت نہیں رہی مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہو کہ ان کی دنیوی ترقی
صرف اس بات پر موقوف ہو کہ اُن کا ایک ایک بچہ انگریزی میں تعلیم یافتہ
ہو جائے لیکن باوجود اس کے یہ ممکن ہو کہ مشرقی تعلیم کے لیے بھی جگہ نکل سکے
ترقی یافتہ قوموں کی مثال ہمارے سامنے موجود ہو یورپ سب کچھ کر رہا ہو
تاہم ان میں ایک وسیع گروہ موجود ہو جو اپنی مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر
کا محافظ ہو"

مولانا شبلی کا حیدرآباد سے یہ اہم غرض وظیفہ مقرر ہوا تھا کہ معمولی درس و

تدریس سے یکسو ہو کر تصنیف و تالیف کریں گے، یہ وظیفہ کالج کی تنخواہ کے مساوی تھا اور یہ مولانا جیسے شخص کے لیے ایک نعمت تھی کہ آزادی کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مصروف ہوں ۱۸۹۶ء میں مولانا حالی کا وظیفہ بھی اُن کے مشاہرہ کے مساوی حیدرآباد سے ہی مقرر ہوا تھا اور اگرچہ وہ اتنے پابند نہ کیے گئے تھے مگر ملازمت سے مستعفی ہو گئے، اسی طرح مولانا شبلی کو بھی مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر (بہ شرطے کہ یہ روایت صحیح ہو) انھوں نے "زیں پس ندوہ و تدریس علوم عرب است" کا نعرہ لگایا، مگر چوں کہ اس نعرے کا اثر تو وظیفے پر پڑتا تھا نیز اس سے ندوہ کے لیے پابندی عائد ہوتی تھی علاوہ بریں حیدرآباد میں ایک عہدے کی توقع تھی (جیسا کہ بعد کو وقوع میں آیا) اس میں خلل پڑتا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ دوستوں کے کہنے اور مولوی سید علی بلگرامی کے مشورے سے جو ریاستی حالات سے خوب واقف تھے مولانا نے اس نظم کو ضائع کر دیا۔ بایں ہمہ ہم کو ابھی تک یقین نہیں کہ مولانا نے اس وقت یہ نظم لکھی ہو خود مصنف کا لفظ "شاید" اس روایت کو مجروح کر رہا ہے تعجب ہے کہ اس یادگار نظم کا صرف ایک ہی مصرعہ یادگار رہ گیا اور وہ بھی اس لیے کہ کالج کے احاطے میں قابل اعتراض ٹھیرے اور مولانا کی زندگی کا رُخ اچھی نظروں سے نہ دیکھا جائے، احاطۂ کالج سے مُراد اینٹ پتھر تو نہیں سکریٹری پرنسپل اسٹاف طلبا اور ٹرسٹیز مراد ہیں مگر مصنف ان میں سے کسی طرف اشارہ نہیں کرتے کہ کس نے قابلِ اعتراض ٹھیرایا اور کس نے اس رُخ کو بُری نظر سے دیکھا مولانا آخر صفر ۱۳۱۴ھ (اگست ۱۸۹۶ء) میں حیدرآباد گئے تھے چار یا پنج ہفتے وہاں مقیم رہے ۳ ربیع الثانی کو فرمانِ وظیفہ صادر ہوا۔ ۱۱ ربیع الثانی کو مولانا کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا، گویا مولانا تقریباً دو مہینے ہفتے تک حیدرآباد میں رہے اگر یہ قصیدہ لکھا بھی ہوگا تو حیدرآباد میں کیوں کہ [illegible]

نمایاں ہے جو کسی خوش خبری کے سنتے ہی دل میں پیدا ہوتا ہے، اور مصنف حیات شبلی کی عبارت کا پرواز بھی یہی ہے اب کالج کے احاطے میں اس کا قابلِ اعتراض ٹھیرنا اور مولوی سیّد علی بلگرامی کا مشورہ دینا کہ ضائع کر دیا جائے خواب کی سی باتیں ہیں کیا سیّد علی بھی ساتھ ہی ساتھ آئے تھے، اور پھر جب کہ "مولانا علی گڑھ کی کش مکش سے یکسوئی اختیار کرنا چاہتے تھے" اور خوش قسمتی سے یہ موقع ہاتھ آ گیا تھا اور انھوں نے وزارت میں یہ تمنا بھی ظاہر کر دی تھی (جیسا کہ فرمان میں درج ہے) کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کر دیں" تو کالج کے کسی اعتراض کا اتنا خوف کیوں تھا کہ نظم کو ضائع کر دیا جائے۔

علی گڑھ سے گھبرانا بھی طبع زاد ہے وظیفے کے بعد ہی مولانا علی گڑھ واپس آتے ہیں "میں علی گڑھ آ گیا ہوں اور حالات اس قسم کے پیش آ گئے ہیں کہ ابھی یہیں بسنا پڑے گا" (خط موسومہ مولوی حمید الدین ع۹ ۳ر دسمبر ۱۸۹۸ء مکاتیب حصۂ دوم)۔ ۱۸۹۸ء کے بعد کالج سے قطع تعلق ہوتا ہے لیکن جون ۱۹۰۳ء میں پھر مولوی حمید الدین کو لکھتے ہیں کہ "میں یہاں سے چھوٹا تو اعظم گڑھ نہیں بلکہ ندوے میں رہوں گا یا کالج میں، وطن سے جی سیر ہو گیا" (خط ۲۱) مولانا ابھی حیدر آباد میں ناظم شعبۂ علوم وفنون ہیں کہ ان کی نسبت کسی نے وہیں سے نواب محسن الملک کو ایک خط لکھا کہ کالج کی برائیاں اور نکتہ چینیاں کرتے رہتے ہیں، یہ خط رفع اعتراضات کی غرض سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہو گیا اور اس سے اخبار البشیر اٹاوہ میں نقل ہوا، اس کو پڑھ کر مولانا نے ۱۱ر اپریل کو حسب ذیل خط بغرض اشاعت لکھا۔

"جناب نواب محسن الملک بہادر، کون یہ گمان کر سکتا تھا کہ ایک شخص جس نے ۱۶ برس تک کالج کی وفادارانہ خدمت کی ہو! ....

.... جس نے اپنی مشہور تصنیفات کا حق تصنیف کالج

گویا جس نے اپنے مقدور کے موافق وقتاً فوقتاً کالج کی مالی اعانت کی ہو
جو اکثر کانفرنس کے جلسوں میں اب تک شریک ہوتا رہا ہو اور جو اب بھی
یہ خواب دیکھتا رہتا ہو کہ اگر اس کو موجودہ تعلقات سے آزادی مل سکے
تو پھر کالج کے احاطے میں رہ کر سال کا بڑا حصہ کالج کی خدمت میں بلا کسی
مالی معاوضے کے صرف کرے اس کی نسبت باغیانہ خیالات منسوب کیے
جائیں تو نواب محسن الملک بلا اس دریافت کے کہ نویسندہ کون شخص ہو
اور اس کا کیا پایہ ہو اور یہ کہ نویسندہ نے جو واقعہ بیان کیا ہو وہ کسی پبلک
موقع کا واقعہ ہو یا پرائیوٹ استسراق سمع ہو اس خط کو چھاپ دیں اور
پھر تمام قوم میں ایک غلغلہ برپا ہو جائے اور لوگ اس کی بنیاد پر مضامین
کا تار باندھ دیں ان ھذا الشئی عجاب۔

ہمارے بزرگ مولانا حالی نے بالکل سچ کہا ہے

اگر سن لیں کسی قومی جماعت میں شکر رنجی
ہزاروں ہوں گے یہ بدفال سن کر شادماں ہم میں

مولوی بشیر الدین نے اسی بات پر تو نواب صاحب کو ٹوکا کہ ایسا خط نہیں
چھاپنا چاہیے لیکن خود بھی اس خط کو چھاپ دیا خوب شد کہ ورنہ ازدم نہ زدم۔
حالاں کہ خط کا محض حوالہ دینا کافی تھا، بہرحال جو ہوا ہوا اور سمجھا جو کچھ لوگوں
نے سمجھا انگریزی میں ایک مثل ہو کہ الزام سے بچنا اپنے آپ کو الزام میں
ڈالنا ہو، میں نے اس پر عمل کیا تھا اور اب بھی اسی پر عمل کرنا چاہتا ہوں
اور ہمارے دوستوں کو اس قدر کان کا کچا اور زود عمل یقین نہ بننا چاہیے
والسلام۔ شبلی"

(نواب صاحب نے اس خط پر یہ نوٹ کیا کہ "مولانا کو یقین رکھنا چاہیے کہ

ان کے دوستوں اور جاننے والوں میں سے کوئی شریف اور سمجھ دار آدمی کان کا کچا اور دشمنِ عقل یقین نہیں)

اس ناگوار واقعے کے بعد بھی ۲ مئی ۱۹۰۷ء کو مہدی حسن کو لکھتے ہیں کہ "سامان ایسے نظر آتے ہیں کہ علی گڑھ کے دام میں دوبارہ گرفتار ہوں اگرچہ یہ وہ دام ہو کہ ؎

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر　　　خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود" (خطوط)

ان واقعات کو پڑھنے کے بعد مولانا شبلی کی آخر زندگی کا ایک بیّن اعتراف اور قابلِ ملاحظہ ہے ۱۹۱۲ء میں اخبار البشیر (اٹاوہ) میں ندوہ کے خلاف جو مضامین شائع ہوئے تھے اس سلسلے کے ایک مضمون میں یہ فقرہ بھی تھا کہ "اسی وجہ سے مجددِ اعظم سرسید رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رائے ہے کہ وہ انگریزی علوم و فنون کو مسلمانوں کی تمام دینی و دنیوی ترقی کا وسیلہ سمجھتے تھے" مولانا نے ان کے جواب میں ایک مضمون شائع کیا اور اس خاص فقرے کے متعلق لکھا کہ "ندوہ جب قائم ہوا تو سرسید مرحوم نے اس کی تائید میں متعدد آرٹیکل لکھے علی گڑھ میں ایک کانفرنس کے جلاس میں خود سرسید مرحوم شریک تھے نواب محسن الملک نے ایک خاص رزولیوشن ندوہ کے مقاصد کی تائید میں پیش کیا اور نہایت مفصل تقریر کی سید محمود نے اس رزولیوشن کی پُرزور طریقے سے تائید کی جس میں یہ بیان کیا کہ ہمارے دو کام ہیں دین و دنیا ہم نے دنیا کی ترقی کا کام اپنے ذمے لیا ہے ندوہ دین کا کام انجام دے رہا ہے اس لیے ہم کو اس مقصد سے پورا اتفاق ہے یہ دونوں تقریریں مفصل ہیں اور کانفرنس کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں سرسید مرحوم کے بعد بھی یہ پالیسی برابر قائم رہی ڈھاکہ کانفرنس میں ندوہ کی تائید کا رزولیوشن دوبارہ پیش ہوا اور نواب وقار الملک نے زور کے ساتھ اس کی تائید کی" کیا یہ واقعات غلط ہیں کیا کانفرنس کی رودادوں میں یہ تحریریں موجود نہیں ہیں اگر ہیں تو کیا مولوی بشیر الدین صاحب ہم سے اس بات کے خواہاں

ہیں کہ ہم سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک سے بغاوت کرکے مولوی بشیر الدین کے علم کے نیچے آجائیں"

اس کے بعد اور الزامی جواب دے کر لکھتے ہیں کہ "کیا انکا یہ مطلب ہو کہ صرف انگریزی علوم و فنون میں کمال حاصل کرنا اور عربی زبان اور مذہبی علوم سے بے بہرہ ہونا تمام دینی و دُنیوی ترقی کا وسیلہ ہو اگر یہ مطلب ہو تو یہ محض تہمت ہو کہ سرسید مرحوم کا یہ خیال اور یہ رائے تھی، سرسید کے زباں داں اب بھی موجود ہیں اور مجھ کو ہرگز توقع نہیں کہ نواب وقار الملک اور ارکانِ کالج اس رائے کو سرسید کی طرف منسوب کرنے پر راضی ہوں گے" (مقالات شبلی جلد ہشتم مطبوعہ دار المصنفین صفحہ ۱۱۴ - ۱۱۶)

یہ مقالات خود مصنف نے ہی ۱۹۳۸ء میں جمع کرکے اپنے دیباچے کے ساتھ شائع کیے ہیں تاہم حیاتِ شبلی میں سرسید پر تہمت محض لگاتے ہیں نہ خوف خدا اور نہ شرم پیمبر۔

نویں شعاع میں (جو آخری شعاع ہو) یہ فقرہ لکھ کر کہ "اختلافات کے تمہید کا آخری بند سیاسی اختلاف ہو" (۲۹۴) رسالہ اسباب بغاوت ہند، کانگریس کی مخالفت پیٹریاٹک ایسوسی ایشن[۵۷] وغیرہ کا تذکرہ اور یونین کے مباحثے (جمہوری و شخصی حکومت) کا اعادہ کیا ہو۔

ہر شخص جانتا ہو کہ یہ واقعات ہندستان کی سیاسی تاریخ کے بہت ہی اہم اور نمایاں اجزا ہیں سیاست کوئی الہامی شریعت نہیں موقت اور اقتضائے حالات کے تابع ہوا کرتی ہو سرسید کی پالیسی بھی اُس زمانے کے مقتضیات پر مبنی تھی اور وہ نہ صرف جمہور مسلمانان کے نزدیک مقبول تھی بلکہ اکثر ہندو بھی سرسید

---

۵۷ ۱۸۸۸ء میں سرسید نے ایک سیاسی انجمن قائم کی تھی۔

سے بھی آگے بڑھ گئیں اور انھوں نے انڈین لائل ایسوسی ایشن قائم کی اور کانگرس والوں کی زبان بندی چاہی، کانگرس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی اس کو بنگالیوں نے قائم کیا سرسید نے تین سال رفتارِ حالات دیکھ کر مخالفت کی مگر صاف الفاظ میں اعلان بھی کر دیا تھا کہ کانگریس والوں سے ہم کو کچھ عداوت نہیں ہے ہم میں اور اُن میں رائے کا اختلاف ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں ہم مسلمانوں کے لیے اور راجپوتوں کے لیے بالتخصیص اور ہمارے ملک کی دیگر اقوام کے ہندوؤں کے لیے اور بالتخصیص ملک کے امن کے لیے نہایت مُضر ہے اس لیے ہم اس کے برخلاف ہیں" انھوں نے اسلامی انجمنوں کے نام جو خط لکھا تھا اس میں ایک بلیغ فقرہ یہ بھی تھا کہ " اگر بہ فرضِ محال کانگرس کے مقاصد پورے ہو جائیں تو ہندستان میں مسلمانوں کا حال یہودیوں سے بھی جن کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ وضربت علیہم الذلّۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ، بہت زیادہ بدتر ہو جائے گا۔"
اب دیکھیے کہ تین چوتھائی صدی کے بعد بھی جمہور اہلِ اسلام پھر اسی ذلت و مسکنت اور غضبِ الٰہی سے بچنے کی جد و جہد میں مشغول ہیں، اور اس وقت بھی یہی ایک نظریہ جو اس فقرے میں ہے سرسید کی سیاسی دوربینی کی دلیل میرہن ہے، سرسید عملی سیاست میں اس وقت داخل ہو چکے تھے جبکہ مولانا شبلی نے جنم لیا تھا لیکن ان باتوں سے قطع نظر مولانا کا سیاسی اختلاف تھا کہاں، یونین کا مفروضہ مباحثہ تو طرزِ حکومت کے ایک اصول و نظریہ سے متعلق ہے ملک کی اس وقت کی سیاست سے تو کوئی تعلق نہیں رکھتا، اختلاف اور اُس کا اثر دو برابر کے آدمیوں میں معلوم ہوتا ہے مولانا شبلی کی سیاسی شخصیت عمل و فکر کے لحاظ سے اس وقت ثمّہ برابر بھی وقعت نہ رکھتی تھی۔

اس کے بعد مصنفِ حیاتِ شبلی نے نہایت سخت الفاظ میں سرسید پر حملہ کیا ہے۔

لکھتے ہیں کہ "۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی لڑائی ہوئی اور اس میں ترکوں کو انگریزوں کی مرضی کے خلاف جو فتح عظیم ہوئی اُس نے ہندستان کے مسلمانوں کو پُر جوش بنا دیا تھا سارے ہندستان میں اس کی خوشی منائی گئی اور بمبئی کے مسلمانوں نے چراغاں کیا سرسیّد کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی اور اس جوش مسرت کے خلاف وہ نہایت سخت مضمون لکھے جو اتحاد اسلامی کے حامی مسلمانوں کو تیر کی طرح آکر لگے اور انھوں نے سرسیّد کی اس انگریزی دوستی پر سخت اعتراضات کیے"۔ (۲۹۵)

مصنّف نے حاشیے پر سرسیّد کے دو مضمونوں "یونان اور ترک" اور "سلطان اور ہندستان کے مسلمان" کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن ان کا کوئی اقتباس نہیں پیش کیا، واقعہ یہ ہے کہ سرسیّد نے دو نہیں بلکہ پانچ مضمون لکھے تھے جن میں بقیہ تین کے عنوان یہ ہیں :-

(۱) عیسائی اور مسلمانوں میں باہمی مودّت (۲) خلافت اور خلیفہ (۳) ترکوں کے ساتھ ہندستان کے مسلمانوں کی ہمدردی، مضمون محولہ حیاتِ شبلی بہ لحاظ سلسلہ ہیں۔ اب ہم ان مضامین کے کچھ اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں تاکہ مصنفِ حیات کے تیروں کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) پہلے مضمون میں مذہبی اور تاریخی بحث کے بعد سرسیّد نے لکھا کہ "حال کے زمانے میں آرمینیا والوں نے بغاوت اور شرارت کی اور یونانیوں نے سر اُٹھایا جس کی سزا وہ پا رہے ہیں اور خدا نے چاہا تو اپنے کیے کی اور سزا پاویں گے اس فساد کو مذہبی عداوت پر مبنی کرنا محض غلطی اور سراپا دھوکہ ہے بلکہ درحقیقت یہ بھی پولیٹکل امور پر مبنی ہے جس کے سبب سے آرمنیا والوں نے بغاوت کی اور یونانی جنگ پر آمادہ ہوئے ہاں ان فسادات کے ساتھ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا آرمنیا والوں اور ان کے منسوبوں نے اور یونانی اور اُن کے طرف داروں نے مذہبی جوش کو بھی شامل کر لیا

جو محض ایک جھوٹا بہانہ ہے، اگر ہم تسلیم کر لیں کہ سلطان کی عمل داری میں انتظام نہایت خراب
ہے اور آرمنیا والوں نے اس خراب انتظام کی وجہ سے بغاوت کی ہے تب بھی یہ بات تسلیم
کرنا پڑے گی کہ یہ فساد مذہبی عداوت کے سبب سے نہیں ہوا بلکہ بدانتظامی کے سبب سے ہوا
اور یہ کہنا کہ سلطان کی عمل داری میں عیسائیوں پر ظلم ہوتا ہے ایسا جھوٹ ہے جس سے بڑھ کر
کوئی نہیں ہو سکتا، عیسائی سلطان ٹرکی کی عمل داری میں نہایت مذہبی آزادی سے
رہتے ہیں اور جتنی رعایتیں اُن کے ساتھ کی جاتی ہیں اتنی رعایتیں مسلمان رعایا کے
ساتھ نہیں کی جاتی ہیں۔ مذہبی آزادی جو ترکوں کی عمل داری میں عیسائیوں کو حاصل ہے
کسی عمل داری میں عیسائیوں کو حاصل نہیں سلطان اُن کے مذہبی مراسم میں مطلق دست اندازی
نہیں کرتا بلکہ ان کی خواہش پر اُن کے لیے بشپ یعنی سردار مذہب مقرر کرتا ہے اور جو
اعزاز کے درجے سلطنت ترکی میں ہیں وہ سب ان کو عطا فرماتا ہے خود عیسائی سلطنتوں
میں اُن عیسائیوں کو جو اس چرچ کے نہیں ہیں جس چرچ کی سلطنتیں ہیں ایسی مذہبی آزادی
نہیں ہے جیسی کہ سلطان کی عمل داری میں تمام عیسائیوں کو خواہ کسی چرچ کے ہوں حاصل
ہے، اس وقت جو لڑائی یونان اور ترکی میں ہو رہی ہے تمام عیسائی سلطنتیں خاموش ہیں
اور کسی سلطنت نے یونان کی مدد نہیں کی اور کچھ شبہ نہیں کہ آخر کو عیسائی سلطنتوں
کو جو ترکی کے ارد گرد ہیں بیچ بچاؤ کے کرنے اور صلح کے ہو جانے میں بالاتفاق
دست اندازی کرنی پڑے اور معلوم نہیں اس کا نتیجہ کیا ہو ٹرکی کے مفید یا یونانیوں
کے مفید مگر اس کی بنا پولیٹیکل امور پر مبنی ہو گی نہ مذہبی امور پر، پس نہایت افسوس
ہے کہ مسلمان یا عیسائی ان ملکی فسادوں کو مذہبی لباس پہنا کر لوگوں کو مشتعل اور
برانگیختہ کریں جس سے سراسر لوگوں کا نقصان ہے جو ایسی باتوں سے مشتعل ہوں اور
ملکی امور کو مذہبی لباس پہنا کر مذہب مذہب پکاریں اور ایسا کرنے سے بجز اس کے
کہ ان کی حماقت سے انھیں کے اہل مذہب کا کچھ نہ کچھ نقصان ہو اور کچھ نتیجہ نہیں

الغرض کچھ شک نہیں کہ ٹرکی ایک مسلمانی سلطنت ہے اگر اس کو واجبی خواہ ناواجبی کچھ نقصان پہنچے تو یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ہم مسلمانوں کو دلی رنج ہوگا اور یہ بات ترکی پر ہی موقوف نہیں ہے اگر ایران کی سلطنت کو مراکو کی سلطنت کو افغانوں کی سلطنت کو انھی کی نادانی اور حماقت اور بدنظمی سے کچھ نقصان پہنچے تو بھی ہم مسلمانوں کو قدرتی رنج ہوگا اور یہی حال تمام قوموں کا ہے کہ اپنی اپنی قومی سلطنت کے زوال یا نقصان سے رنج ہوتا ہے پس اس سے زیادہ ان واقعات کو وقعت دینا اور مذہبی لباس پہنانا محض بے جا اور ناواجب ہے، مسلمانوں میں ایک مدت دراز سے بہ لحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہو گیا ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہو گیا ہے اور "کل مومن اخوۃ" کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے اس لیے وہ ہر ملک کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں اور اس کی خوشی سے خوش اور اس کے رنج سے رنجیدہ ہوتے ہیں اور اس لیے ہم کو اگر خدانخواستہ ترکوں کو نقصان پہنچے تو مثل قومی نقصان کے رنج ہوگا گو وہ نقصان کسی پولیٹیکل سبب سے ہی ہو"

(۲) دوسرا مضمون بھی تاریخی ہے جس میں "خلیفہ" اور "امیرالمومنین" کے القاب پر تاریخی بحث کے بعد لکھا ہے کہ "پس خلافت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد جو لوگ صاحب حکومت ہوئے وہ لوگ بادشاہ یا سلطان یا والی ملک یا امیر وغیرہ قرار پا سکتے ہیں اور جو مذہبی تعلق ہم مسلمانوں کو اُن خلفا سے تھا جو زمانہ تیس برس بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوئے وہ ان حاکموں سے نہیں ہو سکتا جو بعد تیس برس مذکور کے ہوئے خواہ وہ اپنا نام خلیفہ رکھیں یا سلطان یا امیر جو کچھ چاہیں پس ہم کسی مسلمان حاکم کو جو کسی ملک میں حکومت رکھتا ہو بجز ایک مسلمان حاکم کے اور کچھ نہیں خیال کر سکتے نہ اس کو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ خلیفہ رسول اللہ تسلیم کر سکتے ہیں ہاں بے شک اسلامی اتحاد اس کے ساتھ رکھتے ہیں اُس کی بھلائی اور بہتری سے خوش اور اس

کی برائی اور ذلت سے غمگین ہوتے ہیں ۔"

"سلطان ترکی کی اس فتح سے جو اس وقت یونانیوں پر حاصل ہوئی ہے بسبب اس اتحاد قومی کے جو اسلام نے مسلمانوں پر قائم کیا ہے مسلمان نہایت خوش ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ترکوں کی شکست ہوتی تو ہم کو اسی اتحاد کے سبب ضرور رنج ہوتا اور یہ ایک امر انسان کا طبعی ہے جس سے انکار نہیں ہوسکتا، یونانی ہمارے حاکم نہیں ہم ان کی رعیت نہیں، پس ہم کو یہ کہنے میں کہ خوب ہوا کہ یونانیوں نے شکست پائی اور ذلیل ہوئے اور خدا کا شکر ہے کہ ترکوں نے فتح پائی کیا تامل ہے، ہم کو ہرگز نہیں معلوم ہے کہ گورنمنٹ انگریزی کی جس کے امن میں بطور رعیت ہم مسلمان رہتے ہیں اس لڑائی میں جو ترکوں اور یونانیوں سے ہوئی کیا پالیسی ہے اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہے ہم کو اس پر یقین نہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگ وہ بات کہتے ہیں کہ ان کو درحقیقت معلوم نہیں اور اگر بالفرض انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہو تب بھی ازروئے مذہب کے جو ہمارا فرض اپنے حاکموں کی اطاعت اور فرماں برداری کا ہے اس سے ہم کسی طرح سبکدوش نہیں ہوسکتے اور ایسی حالت میں بھی ہمارا فرض ہے کہ اپنی گورنمنٹ کے مطیع فرماں بردار اور وفادار رہیں بہت سے بہت اگر کچھ کرسکتے ہیں تو یہ ہے کہ خدا سے دعا کریں کہ برٹش گورنمنٹ اور مسلمانوں کی سلطنتوں میں خواہ ترکی کی ہو یا ایران یا افغانستان کی یا کسی اور دور دراز ملک کی دوستی دارتباط ہے اور کبھی مخالفت پیدا نہ ہو۔"

(۳) تیسرے مضمون میں "ترکوں کے ساتھ ہندستان کے مسلمانوں کی ہم دردی" (جس میں مصنف کے نزدیک تیر ہی تیر ہیں) پہلے انھوں نے یہ تنبیہ کی کہ "ترکوں کی فتح یابی کو اسلام کی فتح یابی سے پکارنا اسلام کی قدر و منزلت کے خلاف ہے اور اسلام کے معزز نام کو جس نے اصلی فتح پائی ہے اور جو ہمیشہ فتح مند رہے گا ایسے امور دنیاوی

میں شریک کرنا جو دنیوی اسباب پر مبنی ہیں کہاں ناسمجھی کی بات ہے" اس کے بعد لکھا کہ
"ہم کو خوش ہونا چاہیے کہ ایک مسلمان سلطنت اس جنگ میں فتح یاب ہوئی
اور برباد نہیں ہوئی، لیکن اس کو ایک اسلامی لباس پہنانا اور اسلام کی
فتح اسلام کی فتح پکارنا اگر حد سے باہر قدم رکھنا نہیں ہے تو اور کیا ہے اور یہ
فتح ایسی کون سی فتح ہے جس پر اتنا شور و غل مچایا جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ
ترکوں کے آگے یونانیوں کی کچھ حقیقت نہیں ہے اور اگر وہ مقابلہ کریں گے
تو جس طرح ایک باز چڑیا کو مار لیتا ہے اسی طرح ترک یونانیوں کو ماریں گے
اندیشہ اگر تھا تو یہ تھا کہ یونانیوں کو ترکوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت کیوں
ہوئی اور اس لیے خیال کیا جاتا تھا کہ در پردہ کوئی بڑی قوی سلطنت
یونانیوں کی مدد پر ہے اس شبہ کو مسٹر گلیڈ اسٹون کی نامعقول اسپیچوں اور
تحریروں نے اور لندن کے ریڈیکل مجنونوں کی اسپیچوں اور ٹیلیگراموں
نے زیادہ قوی کر دیا تھا مگر ہر سمجھدار سمجھ سکتا تھا کہ نہ مسٹر گلیڈ اسٹون گورنمنٹ
پر ہیں اور نہ ان قلیل ریڈیکل ممبران پارلیمنٹ کا گورنمنٹ پر کچھ اثر پڑ سکتا ہے
پس یہ خیال کر لینا کہ گورنمنٹ انگریزی کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہے
نہایت غلطی اور سفاہت پر مبنی تھی، جب لڑائی کا معاملہ گرم ہوا تو کسی
بڑی سلطنت نے یونانیوں کا ساتھ نہیں دیا اور اس سے ظاہر ہو گیا کہ
نہ گورنمنٹ انگریزی یونانیوں کی مددگار تھی نہ فرانس نہ جرمن نہ اور کوئی
گورنمنٹ، اب آئندہ جو کچھ ہو اس کی بنا پولیٹیکل مصلحتوں پر ہو گی نہ اسلام
کی مخالفت پر، ہندوستان کے مسلمانوں کو جو اس معاملے میں جوش و خروش
ہوا ہماری دانست میں صرف انگریزی اخباروں کا باعث ہوئے ہیں
مسٹر گلیڈ اسٹون نے اور انگریزی اخباروں نے کوئی درجہ اہانت و سخت کلامی

. . .

کا سلطان کی نسبت نہیں چھوڑا تھا اور کوئی بدی اور بڑائی ایسی نہ تھی جو انھوں نے ترکوں کی نسبت نہ لگائی ہو اور یہ سب باتیں خاص کر ترکوں اور عام طور پہ سب مسلمانوں کو نہایت رنج دہ اور سخت رنج دہ تھیں مگر جب ترکوں کی فتح ہوئی تو انھوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا رحم برتا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا مثلاً جب یونانیوں کے ایک گروہ کے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہا تو ترکوں نے اپنے پاس سے ان کو کھانے کو دیا یونانیوں کے مجروحوں کی تیمارداری کی اور نہایت مہربانی سے ان کے ساتھ برتاؤ کیا اب ترکوں کی فتح ہونے کے بعد اس رنج کے مقابلے میں مسلمانان ہند نے حد اعتدال سے زیادہ خوشی ظاہر کی اور گورنمنٹ انگریزی نہایت خاموشی سے ان سب باتوں کو دیکھتی رہی ہم بھی اس خوشی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے مگر یہ جتلاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہندوستانی انگریزی گورنمنٹ کی رعایا ہیں مگر اس کو بھولنا نہیں چاہئے کہ ہم غیر سلطنتوں کے ساتھ پولٹیکل امور میں کوئی کام اور کوئی فعل ایسا نہیں کر سکتے جو گورنمنٹ کے خلاف ہو پس ہم کو لازم ہے کہ ہم وہی کریں جو گورنمنٹ کی مرضی کے برخلاف نہ ہو۔

(۴) چوتھے مضمون "سلطان اور ہندوستان کے مسلمان" کی بنیاد یہ تھی کہ اسی عنوان کے نیچے قسطنطنیہ کا ایک تار مورخہ ۱۷ر جون ۱۸۹۷ء چھپا تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "جو جواب سلطان نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مبارک بادیوں کا ارسال فرمایا ہے جو انھوں نے یونان پر ترکی فتوحات کی نسبت سلطان ممدوح کی خدمت میں بھیجی تھیں وہ ایک طولانی چٹھی میں درج ہے جس میں خلیفہ کی نسبت تمام سچے مسلمانوں کے فرائض بیان کیے گئے ہیں جن میں نقصانات نقدی اور اخلاقی اور جسمانی شامل ہیں چٹھی مذکور کے خاتمے پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کی قوت اتفاق اور یک جہتی پر منحصر ہے۔ یہ چٹھی خاص ایلچیوں کی معرفت ہندوستان اور مصر اور عرب کے شیوخ اور علما کے پاس بھیجی جائے گی۔" سر سید نے اپنے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ یہ اصلاح

انٹرنیشنل لا کے مطابق صحیح نہیں معلوم ہوتی اور پھر یہ دکھایا ہو کہ سلطان نے مبارک باد کیا کے جو جواب بھیجے وہ اپنے سفرا کے پاس بھیجے تھے اور پھر جب کہ ہندستان کے مسلمان سلطان ٹرکی کی رعایا نہیں ہیں تو ہندستان کے مسلمانوں کو خلیفہ کی نسبت کیا فرائض بیان ہو سکتے ہیں کیوں کہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے بجز اس کے کہ وہ جس سلطنت کی حکومت میں بطور رعایا کے رہتے ہیں اُس کے خیر خواہ اور وفادار رہیں اور کچھ فرض نہیں ہی" پھر انھوں نے یہ مطلب لیا ہو کہ " اگر ایسی چٹھی میں نقصانات سے کوئی مطلب ہو تو وہ مصر اور عرب سے متعلق ہوگا جو سلطان کی رعیت ہیں یا یہ کہ ان ممالک سے جو تہنیت نامے گئے تھے ان کے جواب میں سلطان نے کوئی چٹھی نہ بھیجی ہوگی اس کے بعد انھوں نے لکھا ہو کہ " سلطان نے جو یونانیوں پر فتح پائی اس سے کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جس کا دل خوش نہ ہوا ہو ہم بھی کہتے ہیں کہ سلطان کی اس فتح سے ہمارا دل بھی نہایت خوش ہوا ہی لیکن جو کچھ ہندستان کے مسلمانوں نے کیا بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ کے ہم اس کو اچھا نہیں سمجھتے گو گورنمنٹ نے اس پر کچھ التفات نہیں کیا مگر جن مسلمانوں کو ایسا کرنا تھا ہمارے نزدیک ضرور تھا کہ اول گورنمنٹ سے اس کی اجازت حاصل کرنے اور اس کے بعد جو کچھ ان کو کرنا تھا کرتے۔ ہم ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ایسے پولیٹیکل اُمور میں جو دوسری سلطنتوں سے متعلق ہیں بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ ہندستان کے مسلمان کوئی کارروائی کریں کیوں کہ ہمارا قانونی اور مذہبی فرض یہ ہی کہ ہم ہمیشہ اپنی گورنمنٹ کے وفادار اور اس کی مرضی اور پالیسی کے تابع رہیں اور یہ بات تو کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ دکن کے ہندوؤں نے کس خیال سے سلطان کو اس فتح کی بابت مبارک باد بھیجی کیا وہ بھی ان فرائض میں داخل ہونا چاہتے ہیں جو سلطان مسلمانوں کی نسبت قرار دے۔

آخر کو ہم پھر بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا ٹیلیگرام یا تو غلط ہی یا اس میں

مسلمانان ہندستان کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے"

"جبکہ ترکوں نے سپاسٹاپول کی لڑائی میں روسیوں پر فتح پائی تھی اس وقت مسلمانانِ ہند نے کوئی علامت ایسی خوشی کی ظاہر نہیں کی تھی جیسے کہ یونانیوں پر فتح پانے پر ظاہر کی ہے"

سپاسٹاپول کی لڑائی میں خود انگریزی گورمنٹ نے ترکوں کے لیے ہندستان میں چندہ کرنے کی اجازت دی تھی لیکن اگر ہماری یاد میں کچھ غلطی نہ ہو تو اس وقت بھی ترکوں کے لیے کوئی معتدبہ چندہ ہندستان میں نہیں ہوا تھا۔

"پس یہ بات غور کرنے کی ہے کہ یونان پر فتح پانے میں ہندستان کے مسلمانوں نے کیوں ایسی گرم جوشی ظاہر کی۔

"ہماری رائے میں اس کے دو سبب ہیں اوّل یہ کہ یورپ کے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ہندستان کے مسلمانوں کو کوئی بہت بڑا تعلق سلطان ٹرکی سے نہیں ہے پس مسلمانانِ ہندستان نے عملی کارروائی سے ظاہر کیا کہ ان کو سلطان ٹرکی سے جو حرمین شریفین کا محافظ ہے خاص قسم کا تعلق ہے قطع نظر اس سے کہ سلطان ٹرکی خلیفہ ہے یا نہیں اور مسلمانوں کو اس کے احکام کا تسلیم کرنا لازم ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ مسٹر گلیڈسٹن اور دیگر ریڈیکل ممبرانِ پارلیمنٹ نے نہایت سخت اور محض بے جا اور ناواجب زبان درازی سلطان ٹرکی اور ترکوں کی نسبت کی جس سے مسلمانانِ ہند کے دل نہایت رنجیدہ تھے سبب کہ ترکوں کو یونانیوں پر فتح ہوئی تو جس قدر زبان درازی سے مسلمانوں کو رنج ہوا اُسی قدر ان کو خوشی کرنے کا موقع ملا۔ مگر اس خوشی کو کسی پولیٹیکل امور پر محمول کرنا ہماری رائے میں بے جا ہے اور اس سے زیادہ اور کوئی امر ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا"

پانچویں مضمون (ترکوں کے ساتھ ہندستان کے مسلمانوں کی ہمدردی

میں ۱۸۵۵ء، ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۸ء میں روس اور ترکی لڑائی میں انگریزوں نے جس طرح روس کے ہاتھوں سے ترکی کو بچایا اس کو بیان کرکے یہ سوال کیا ہو کہ پس اب یہ سوال ہو کہ ایسی ہم دردی جو انگلستان کی طرف سے ترکوں کی نسبت ظاہر ہوئی ہندستان کے مسلمانوں نے اس کا شکریہ کیوں نہیں ادا کیا؟"

"ادہم پاشا نے یونانیوں کی حال کی لڑائی میں اس سے زیادہ بہادری اور دلاوری نہیں دکھائی جس قدر کہ عثمان پاشا نے پلونا میں دکھائی تھی پس کس وجہ سے ہندستان کے مسلمانوں نے ادہم پاشا کا بہت شکر کیا اور عثمان پاشا کی نسبت کچھ نہیں کیا ہمارے پاس اس کا کچھ جواب نہیں ہو ہمارے نزدیک جو کچھ اس وقت مسلمانوں نے کیا وہ صرف ان کی ایک خفیف الحرکتی تھی اور ایک کے دیکھا دیکھی اوروں نے بھی وہی کیا جو انھوں نے کیا تھا۔

جو لوگ اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو یونان کی فتح پر اس قدر خوشی منائی وہ کسی پولیٹیکل امر پر مبنی تھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہو اور بجز خفیف الحرکتی کے اور کوئی امر نہیں ہو۔ سلطان کو خلیفہ ماننا اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو جس طرح کہ بنی امیہ اور بنی عباس کو خلیفہ کہا جاتا ہو کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو جو سلطان ترکی کے احکام کو مثل احکام پوپ کے واجب التعمیل سمجھتا ہو یا مثل احکام خلفا راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے جانتا ہو۔ پس کسی طرح یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ ان کا خوشی منانا اور مبارک باد کے تار بھیجنا کسی پولیٹیکل امر پر مبنی ہو گو کہ ہمارے نزدیک ان کا ایسا کرنا بھی بلا اجازت گورنمنٹ کے جس کے کہ وہ رعیت ہیں ہرگز مناسب نہیں تھا۔"

ان اقتباسات سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ترکی معاملات میں سرسید کی رائے کیا تھی اور ترکوں سے ان کو محبت تھی یا نفرت۔ اور ان کی فتح یابی کی خوشی کو انھوں نے

نے جذباتی آدمی کی نظر سے دیکھا یا ایک دور بین ماہر سیاست کی آنکھوں سے، اور آیا ان کے مضامین تیر تھے یا حقیقت پر مبنی۔ ۱۹۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد جب مسلمانان ہند نے مسئلۂ خلافت کو جوش وخروش کے ساتھ اٹھایا ہے تو ان کو سب سے بڑی تائید سر تھیوڈر ماریسن سابق پروفیسر و پرنسپل علی گڑھ کالج سے ملی جو سر سید کے تربیت یافتہ تھے، دس سال تک انڈیا کونسل کے بھی رکن رہے تھے اور جنھوں نے اہم جنگی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ سر تھیوڈر ماریسن نے سنہ ۱۹۱۹ء میں جب کہ مسلمانوں کی جانب سے لندن میں میمورنڈم اور عرض داشتیں پیش ہورہی تھیں حکومت کے لیے ایک تنبیہ آمیز مضمون شائع کیا تھا جس میں مسلمانوں کے احساسات و جذبات کی زبردست ترجمانی کی تھی اور اپنے سنی سالہ تجربات کا نچوڑ پیش کیا تھا اس مضمون میں انھوں نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ "ایک عظیم الشان مسلمان نے ربع صدی قبل مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری حالت یہودیوں کی سی ہوجائے گی اور ہمارا کوئی ملک نہیں رہے گا۔"

اسی گفتگو کو انھوں نے ایک اور مضمون[۱] میں اس طرح دہرایا ہے کہ "سر سید احمد نے مجھ سے کہا کہ جب بہت سی مسلم سلطنتیں موجود تھیں تو ہمیں ان میں سے ایک سلطنت کی تباہی پر زیادہ افسوس نہیں ہوا تھا لیکن اب جب کہ صرف چند سلطنتیں باقی رہ گئی ہیں ہمیں ان میں سے ایک چھوٹی سلطنت کے ضائع ہوجانے کا بھی احساس ہوتا ہے اگر ٹرکی کو فتح کرلیا گیا تو وہ بہت بڑا صدمہ ہوگا کیوں کہ وہ اسلام کی دول عظمیٰ میں سے آخری دولت ہے جو باقی بچی ہے ہمیں یہ خطرہ ہے کہ کہیں ہم یہودیوں کی طرح ایک ایسی قوم بن کر نہ رہ جائیں جس کا اپنا کوئی ملک بھی نہیں ہے۔"

مولانا شبلی نے بھی اسی زمانے میں ایک مضمون خلافت پر لکھا تھا جس میں مذہب

---

[۱] پولیٹیکل انڈیا۔

کی رو سے منصب خلافت کی حقیقت پر بحث کی تھی اور آخر میں دکھایا تھا کہ "جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ خلافت صرف تیس برس رہے گی پھر سلطنت ہو جائے گی، اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ تیس برس کے بعد جو فرماں روا ہوئے وہ باوجود قریش ہونے کے خلیفہ نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے بہرحال تمام روایات کا قدر مشترک یہ ہے کہ خلافت کے لیے قریش ہونا ضرور ہے اور جو شخص قریش کے خاندان سے نہ ہو وہ کسی طرح تمام مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ سلطان سلیم فاتح مصر کے برائے نام خلیفہ المتوکل کو بہ جبر قسطنطنیہ لایا اور خلافت کے لقب سے دست بردار ہونے پر اور اپنے نام پر یہ لقب منتقل کرنے پر مجبور کیا۔"

مصنف حیات شبلی اس مضمون کو "آورد تھی آمد نہ تھی" اور "لکھوایا گیا" سے تعبیر کرتے ہیں گویا سرسید کے اثر سے مولانا نے اپنے اعتقاد اپنے مذہب اور ضمیر کے خلاف احادیث میں تاویل ... کی ... ۱۹۱۱ء کی نظموں میں بھی خلافت کا لفظ نہیں پاتے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے پورے غور کے بعد اور اپنے ضمیر کے مطابق یہ مضمون لکھا تھا پھر ۱۹۰۶ء میں ان کا ایک اور مضمون ندوۃ العلما کے آرگن الندوہ میں ہماری نظر سے گزرتا ہے جس کا عنوان تھا "مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے" کیا یہ بھی سرسید کے روحانی خوف سے لکھا تھا مولانا نے کہیں اور کسی جگہ ان مضامین کے مطابق اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔

۱۸۹۷ء ہی میں سرحد پر بھی شورش تھی اور فوجی اقدامات جاری تھے اور مسلمانان ہند کے خلاف یہ شہرت دی گئی تھی کہ "ہندستان میں انگریزی حکومت اور اس کی مسلمان رعایا کے درمیان روز بہ روز مخالفت روبہ ترقی ہے" سرسید بلاوجہ مسلمانوں کی طرف سے بدگمانیوں کا پیدا ہونا قوم کے حق میں ہمیشہ مضر سمجھتے تھے اور دلیری کے ساتھ ان کے دور کرنے میں کوشش کرتے تھے ۱۸۵۷ء کے پر شور و پر خطر دور میں انھوں نے

نے مسلمانوں کے متعلق جو متعصبانہ شکوک وشبہات تھے نہایت جرأت کے ساتھ اُن کا ازالہ کیا ۱۸۸۵ء میں جب وہابیت کو ایک خطرہ سمجھا گیا اور وہ بغاوت کے مُرادف قرار دی گئی تو پھر وہ میدان میں آئے اور اپنے وہابی ہونے کا اعلان کیا اس موقع پر بھی انھوں نے یہی اور لارڈ الجن وائسرائے وگورنر جنرل ہند نے علی گڑھ آکر اس شہرت کی غلطی کا اپنی تقریر میں اعتراف کیا۔

اس آخری حملے کے بعد پھر سرسید اور کانگریس پر بحث کرتے ہوئے مولانا شبلی کے ایک خط ستمبر ۱۹۱۲ء کا حوالہ دیا ہے کہ "رائے میں ہمیشہ آزاد رہا سرسید کے ساتھ سولہ برس رہا لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگرس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔" (۲۹۷)

اس خط سے یہ تو ماننا پڑے گا کہ سفرنامہ روم ومصر وشام کی ترتیب اور مضمون خلافت وغیرہ کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ انھیں کا طبع زاد ہے ورنہ مولانا نے آزادی رائے اور پولیٹکل مسائل میں اختلاف کا جو ادعا کیا ہے وہ غلط ہوگا۔

اب ہم اس خط کے متعلق بھی کچھ توجہ دلائیں گے، مولانا نے فروری ۱۹۱۲ء میں ایک مسلسل مضمون "مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ" کے عنوان سے شائع کیا تھا، اس کی اشاعت پر اُن کے بعض احباب نے اعتراض کیے کہ وہ قدیم مسلک سے منحرف ہو گئے ہیں اس کا جواب مولانا نے ایک نظم میں دیا جس کی تمہید میں ارشاد ہے ؎

(۱) معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم — جُرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن

(۲) میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست دمبدم — کیوں بنہ کی تقلید طرز زمرہ نمایانِ زمن

(۳) کانگریس سے مجھ کو اظہارِ برأت کیوں نہیں — کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

مگر مولانا کہیں یہ نہیں فرماتے کہ میں تو ہمیشہ سے ہندوؤں کا ہم سخن تھا اور آئینِ کہن کا باغی، بلکہ معترضین کو الزامی جواب دیتے ہیں کہ ؎

(۱) خیر ہیں تو شاملِ اعمال سے جو ہوتی ہوں | آپ تو فرمائیے کیوں آپ نے بدلا چلن
(۲) آپ بھی تو جادۂ (سید) سے ہیں اب منحرف | اب تو اوراقِ وفا پر آپ کے بھی ہیں شکن

یہ نظم بھی ستمبر میں شائع ہوئی اور محولہ خط (پرائیوٹ) بھی اسی مہینے کا ہی، مولانا نے جو اقتباس خط میں کیا ہی اس کا ان کی عملی و علمی زندگی میں کوئی پرتو یا جگنو کا سا چمکارا بھی نظر نہیں آتا اور یہی قیاس کیا جا سکتا ہی کہ ندوہ سے آثارِ جدائی کے بعد مولانا سیاسیات میں داخل ہونا چاہتے تھے اور اس وقت سیاسی حالات سے مسلمانوں میں بھی ہیجان تھا اس سے فائدہ اٹھانا مقصود تھا۔ تعجب ہی کہ سرسید کی سولہ سالہ رفاقت اور کانگرس کے متعلق مولانا کی یازدہ سالہ (۱۸۸۷ء تا ۱۸۹۸ء) مخالفت میں اُن کے دعوے کی کوئی ایک نشانی و علامت بھی نہیں ملتی، بلکہ برعکس[۱] نظر آتی ہی البتہ مصنف نے تائید میں ایک یہ بیان پیش کیا ہی "ایک نہایت ثقہ اور معتبر بزرگ (مولانا شیروانی) جو مولانا کے بڑے گہرے دوست، ساتھ ہی سرسید کی تحریک کے پرانے حامی اور اس کی جلوت و خلوت کے تمام اسرار سے واقف ہیں مولانا کے اوراقِ حیات کے ایک مسودہ پر جس میں مولانا کی دل برداشتگی کی تفصیلات تھیں اپنے قلم سے یہ ارقام فرمایا کہ" دل برداشتگی کی وجہ سیاسی آرا کا اختلاف بھی تھا مولوی شبلی اس جدید تحریک کے حامی ہو چکے تھے" (۲۹۸) اس کے بعد ہی مصنف کا ایک فقرہ یہ بھی ہی کہ" اس سلسلے کی نئی کڑی ندوۃ العلما کی شرکت کا سبب بن گئی یہ مجلس اس زور و شور سے اٹھی تھی کہ حکّام کو خیال ہو گیا کہ اس سے مسلمانوں میں بغاوت پھیل جائے گی بعض غرض مندوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اس کو یہ رنگ دے کر لفٹننٹ گورنر تک پہنچایا اور لفٹننٹ گورنر نے بھی مولانا کا علی گڑھ میں رہنا مناسب نہیں سمجھا"

---

[۱] مضمون الندوہ "مسلمانوں کو غیر مذہب کی حکومت میں کیوں کر رہنا چاہیے" ۔
ایڈریس بہ تقریب سنگِ بنیاد دارالعلوم ندوۃ العلما ،

مولانا شیروانی کی ثقاہت اور اعتبار مسلّم مگر یہ کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کی تحریک کے جلوت و خلوت کے تمام اسرار سے واقف ہیں۔ علی گڑھ یا سرسید کی تحریک کے اثر سے تو ان کو اتنا بچایا گیا کہ انگریزی تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل کرنے کے بجائے ان کو آگرہ کالج میں بھیجا گیا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہاں علی گڑھ کے شیروانی رؤسا نے اس تحریک کی مدد کی وہاں ایک حصے نے مخالفت میں بھی زبردست حصہ لیا اور سرسید نے اپنی رپورٹوں میں بھی اس کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس ضلع یا پڑوس کے اضلاع مثل بلند شہر یا ایٹہ کے کسی مسلمان رئیس نے اپنے بیٹے کو اس کالج میں داخل نہیں کیا ان اضلاع کے رئیسوں نے اب تک اس پاکیزہ اور شیریں پانی کی نہر سے جو اُن کے گھروں کے پاس پاس بہ رہی ہے اور دُور دراز کے آنے والوں کو فیض پہنچا رہی ہے پانی پینے پر پیاسا رہنے کو ترجیح دی ہے" (۸۷۸ء)...... ہمارے ضلع کے رؤسا میں سے بھیکم پور کے رئیسوں نے بہ استثنائے محمد عنایت اللہ خاں صاحب ہمارے کالج کی طرف کچھ توجہ نہیں کی (۱۸۷۲ء)

ان ثقہ بزرگ کے عم محترم رئیس بھیکم پور عرصے تک اس تحریک سے کنارہ کش ہی رہے البتہ جب یہ بزرگ خود بالغ نظر ہوئے تو اوّل مرتبہ ان کا نام کانفرنس کے عام ممبروں کی فہرست میں نظر آیا لیکن انھوں نے عرصے تک کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ اسی طرح ۱۸۹۶ء میں ڈیفنس ایسوسی ایشن کی فہرست ارکان میں ان کا نام نظر آتا ہے جو ایک سیاسی انجمن تھی ۱۸۹۳ء میں سرسید نے اور نوجوانوں کے ساتھ ان کو بھی زمرۂ ٹرسٹیان میں داخل کر لیا اس طرح اصلاً وہ ۱۸۹۶ء سے وابستۂ تحریک ہوئے اور یہ سرسید کا آخری سالِ زندگی تھا۔ اس لیے جلوت و خلوت کے اسرار کی ہوا بھی ان ثقہ بزرگ کو نہیں لگی۔ مولانا شبلی کی جدید تحریک کی حمایت اور سیاسی آرا سے دل برداشتگی پر بھی غور کرنا چاہیے کانگرس تحریک ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئی ۱۸۸۷ء

میں سرسید نے مخالفانہ تحریک اُٹھائی۔ ۱۸۹۴ء تک دس سال اور آٹھ سال گزر چکے تھے
اور یہ تحریکیں پُرانی ہو چکی تھیں مگر مولانا کی کوئی حمایت و دل بستگی کا رشتہ بھی
نہیں پایا جاتا بلکہ ۱۸۹۵ء میں شمس العلما کے خطاب پر تو مولانا نے جو تقریر کی ہے
اس سے دلی وابستگی ہی پائی جاتی ہے اور کالج سے قطع تعلق کے بعد بھی کالج ہی
میں رہنے کا ولولہ نظر آتا ہے۔

اب اس سلسلے کی نئی کڑی کو دیکھیے جو ایک خط سے تیار کی گئی ہے اور
مصنف نے صرف حاشیہ پر ایک حوالہ "مکاتیب شبلی بہ نام مولانا شیروانی (۴۱)
کافی تصور کیا ہے اس نئی کڑی سے یہ رشتہ پیدا کیا گیا کہ علی گڑھ سے علیحدگی میں لفٹنٹ
گورنر کا بھی دخل تھا کیوں کہ ندوہ بغاوت کا منبع تصور کیا گیا، لیکن سلسلہ واقعات پر
غور کرنے سے یہ کڑی ٹھیک نہیں ملتی، ندوہ کی تحریک ۱۸۹۴ء میں اُٹھی علی گڑھ
سے زبردست تائید ہوئی اور مسلسل اس کے اجلاس ہوتے رہے، مصنف نے صفحہ
۳۵۱ پر حکومت کی بدگمانی کا زمانہ ۱۹۰۰ء و ۱۹۰۱ء متعین کیا ہے، یعنی ۱۸۹۹ء
تک کوئی بدگمانی نہ تھی اور مولانا سرسید کی رحلت (۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) کے ایک
ماہ بعد مئی میں چھ مہینے کی رخصت لے کر گئے اور اس زمانے کے بعد مستعفی ہو گئے۔ (ملاحظہ
ہو صفحہ ۳۳۲) مصنف نے بدگمانی کا جو زمانہ متعین کیا ہے مولانا اس وقت حیدرآباد
میں (۲۲ مئی ۱۹۰۱ء) ناظم سررشتہ علوم و فنون مقرر ہو چکے تھے۔ اس لیے
علیحدگی میں لفٹنٹ گورنر کا ہاتھ کیوں کر شامل ہو سکتا ہے۔ جس خط پر یہ قصہ محول کیا
وہ ۲۴ اگست ۱۹۰۱ء کا ہے جب کہ حکم رانِ صوبہ کا دور بدلتے ہی بدگمانی کے بادل
چھٹ چکے تھے خط کا مضمون یہ ہے:

"اس ہفتے میں نواب محسن الملک کا خط آیا کہ وہ نواب لفٹنٹ گورنر سے ملے
اور یہ معلوم ہوا کہ لفٹنٹ صاحب نے میرے متعلق جو گورنمنٹ کو شکوک تھے رفع کر دیے

اور یہ بھی لکھا کہ اب اُن کو علی گڑھ کالج اگر بلانا چاہے تو بلا سکتا ہے۔ محسن الملک نے مجھ کو اس اطلاع کے بعد لکھا کہ کالج میں آجاؤ وظیفہ حیدرآباد بھی جاری ہوجائے گا اور سو روپیہ کالج سے بھی ملیں گے لیکن میں نے منظور نہیں کیا اور کوشش میں تھا اور ہوں کہ وظیفہ جاری ہوجائے تو ندوہ میں آجاؤں۔" اس حوالے سے بھی اس نئی کڑی کا کوئی سلسلہ نہیں ملتا، اس خط کے ۱۴ دن بعد دوسرے خط[ا] نمبر ۳۴ مورخہ ۶ ستمبر میں لکھتے ہیں کہ "ابھی ابھی نواب محسن الملک کا خط آیا کہ لفٹننٹ گورنر حال نے میرے متعلق فیصلہ کردیا اور رائے دی کہ چاہو تو علی گڑھ اُن کو بلالو، اس صورت میں مالی فائدہ بھی ہے اور شہرت بھی، باوجود اس کے اگر ندوہ میں آنا چاہتا ہوں تو اس میں کیا خود غرضی ہوسکتی ہے۔"

یہ بھی دیکھیے کہ ان دونوں خطوں میں کس قدر تباین ہے ۲۴ راگست کو لکھتے ہیں کہ اس ہفتے میں محسن الملک کا خط آیا اور جواب دے دیا، پھر ۶ ستمبر کو ابھی ابھی دوسرا خط کیسا اور پھر علی گڑھ میں مالی فائدہ فہم سے بالاتر ہے، اس وقت مولانا کو چارسو روپیہ (حالی) ماہانہ ملتا تھا اور اگرچہ وظیفہ ملازمت کے باعث مسدود تھا مگر ترقی کی امید بھی تھی محسن الملک سو روپیہ ماہانہ پیش کرتے ہیں اور وظیفہ کے ساتھ یہ رقم دو سو روپے ہوجاتی ہے پھر بھی بحساب سکۂ کلدار ڈیڑھ سو روپے کا نقصان رہتا ہے۔ یہ مالی فائدہ کہاں سے آگیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون ہی طبع زاد ہے۔

مولانا شبلی کالج کے ایک پروفیسر تھے اُن کے اختلاف سے سرسید کو دل برداشتہ ہونا چاہیے تھا نہ کہ مولانا کو، نیز مسٹر بیک جو اُن کے بالادست افسر اور بقول بعض سرسید کے سیاسی مشیر تھے اگر بے زار ہوجاتے تو بجا تھا کیوں کہ مولانا کی سیاسی راؤں سے طلبا کے متاثر ہونے کا امکان تھا، لیکن ہم تو ۱۸۹۶ء میں جب کہ مولانا

[ا] اس دوسرے خط کا حوالہ حیات شبلی میں نہیں ہے۔

طرح بلین خصت کی فکر میں ہیں ان دونوں کو اس بات پر منحصر پاتے ہیں کہ وہ چھ ماہ کالج
میں گزاریں، اور یہ ایک دوسرا ثبوت اس امر کا ہے کہ سلسلے کی نئی کڑی انتہائی بودی
ہو مولانا کی سیاسی آرا کے اختلاف سے دل برداشتگی، اور جدید تحریک کی حمایت بھی ایک
عجیب و غریب معمہ ہے، وہ سرسید کی رحلت کے بعد جب کہ ان کی سیاست ختم ہو چکی
تھی کالج سے مستعفی ہوتے ہیں لیکن جدید تحریک کی حمایت میں قلم و قدم نہیں اٹھاتے
حالاں کہ حیدرآباد سے تعلق پیدا ہوتے تک وہ آزاد تھے پھر اس تعلق کے ختم ہونے
کے بعد وہ ندوہ میں آجاتے ہیں جہاں اگرچہ سیاست "شجر ممنوعہ" تھی لیکن مولانا پھر
بھی آزاد تھے تاہم اس دورِ آزادی میں بھی ان کی حمایت کانگریس معمہ بنی رہی اس لیے
یہ سب دعویٰ اور بیان مہملات سے زیادہ وقیع نہیں اور مولانا شیروانی کا بیان محکِ تحقیق
پر کھرا نہیں اترتا، محض ثقاہت دلیلِ صداقت نہیں ہوتی۔

یہ امر اور ناقابلِ فہم ہے کہ علی گڑھ کی سیاست سے تو مولانا کو گھٹن ہونے لگی
بیک صاحب کی سیاست سے وہ بےزار تھے جس کا مقصد کالج کو غلامی و وفاداری
کا سبق تھا مگر ندوہ میں آنے کے لیے بے قرار تھے جہاں گورنمنٹ انگریزی کی وفاداری
و خیر خواہی بطور ایک مذہبی فرض کے تھی جس کا ارکان ندوہ نے ہمیشہ اعلان بھی کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ شہرت کے لحاظ سے تو بڑا امیدان تھا مگر مالی منافع بہت
کم تھے اور مولانا شبلی اب اس تنخواہ میں جو ملتی تھی پابندی کے ساتھ بسر نہیں کر سکتے
تھے اخراجات کا بار تھا دوسرا عقد بھی کر چکے تھے اور خانگی حالات بھی کچھ ایسے
ہی مقتضی تھے کہ وہ زیادہ نفع کی راہ تلاش کریں اس لیے مولانا نے حیدرآباد کا
رُخ کیا تھا مگر سرسید کی زندگی میں وہ کالج چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے اس لیے
پھر واپس آگئے اور جب سرسید کا انتقال ہو گیا تو حیدرآباد چلے گئے۔ یہاں معقول
مشاہرہ تھا اور جب تک حالات سازگار رہے ملازمت کی۔

۱۳۔ کالج سے رخصت لینے کی تجویز

کے عنوان میں لکھتے ہیں کہ "کئی برس سے ہوا کی ناموافقت اور کثرتِ دماغی محنت کے سبب سے مولانا کا معدہ صحیح نہیں رہا تھا ۶ مارچ ۱۸۹۶ء کو لکھتے ہیں کہ میں دو ایک مہینے سے بالکل بے کار رہتا ہوں دماغ سے کچھ کام نہیں ہو سکتا اب کی انشاء اللہ مکان پر نہایت مستعدی سے علاج کراؤں گا میری خواہش ہے کہ تمام تعطیل اعظم گڈھ میں بسر کروں بشرطیکہ دو تین دن سے زیادہ نہ ہوں"

اس کے بعد سید محمود کے سوءِ مزاج اور مولانا کی یکسوئی میں خلل اندازی کو بیان کرتے ہوئے تحریر ہے کہ "انھوں نے مولانا پر عدم لیاقت کا الزام قائم کیا اور ان سے بعض درجے چھین لیے اور یہی ان کے اس ہنر کو عیب ٹھہرایا کہ یہ دینیات کے سبق اپنے حسنِ تقریر سے اس قدر دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ لڑکے دوسرے مضامین کی طرف توجہ کم دیتے ہیں" (صفحہ ۳۱۹)

اب ایک تیسرا سبب بیان کرتے ہیں کہ "مولانا کی پریشانی کی تیسری چیز بیک صاحب کی سیاست تھی انھوں نے ایک مسلّمہ مسلمان لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور پردے کے پیچھے سے سیاست کی کٹ پتلیوں کو حرکت دیا کرتے تھے مولانا ان کے طرزِ سیاست کو جس کا مقصد کالج کو غلامی اور وفاداری کا دلچسپ دل پذیر سبق پڑھانا تھا سخت ناپسند فرماتے تھے" اب ارشاد ہے کہ "اسی زمانے میں ایک بار دیوانِ حافظؒ کھول کر فال دیکھی کہ کالج کی قید سے مجھے کب رہائی نصیب ہوگی، خواجہ حافظؒ نے جواب دیا کہ "ع، وقت آن ست کہ بدرود کنی زنداں را" مولانا نے خواجہ صاحبؒ کی اس نصیحت پر عمل کیا اور ایک سال کے لیے اس قید خانے سے رہائی کی درخواست دی۔ یعنی دسمبر ۱۸۹۶ء سے نومبر ۱۸۹۷ء تک کی رخصت لی اور اعظم گڈھ چلے آئے مگر یہاں آ کر ان کا جی نہ لگا فروری ۱۸۹۷ء

میں پھر وہ علی گڑھ گئے لیکن پھر واپس آ گئے اور جون جولائی اور اگست ۱۸۹۷ء اعظم گڑھ میں گزارے ..... اور اگست بھر یہیں رہ کر نومبر ۱۸۹۷ء میں علی گڑھ واپس چلے گئے اور یہ کوشش شروع کی کہ ان کو کالج سے کافی طویل رخصت مل جائے" (صفحہ ۳۲۰ و ۳۲۱) اسی ۱۸۹۷ء کے سال کو صفحہ ۵۸۷ پہ یوں دکھایا ہے کہ "۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ جب پیش آئی تو وہ علی گڑھ میں تھے اور سرسید کا نقطہ نگاہ سب کو معلوم ہے گو مولانا نے اس موقع پہ اپنے کو قابو میں رکھا لیکن ان کو علی گڑھ کی فضا میں اندر سے گھٹن ہونے لگی اور نتیجہ اس قسم کی سیاسی کش مکش کا علاحدگی تھا۔"

اب تک مولانا کو ۱۴ سال علی گڑھ میں گزر چکے تھے اور وہاں کی آب و ہوا کی کبھی کوئی شکایت نظر نہیں آئی مگر ۱۸۹۷ء میں مصنف حیاتِ شبلی نے پیدا کر دی حالاں کہ خط میں مولانا دو ایک مہینے سے ناسازی طبع کی شکایت فرماتے ہیں؛ سید محمود کا مزاج بلاشبہ آخر ۱۸۹۰ء میں بگڑ چلا تھا لیکن ججی سے سبک دوشی کے بعد ان کے متعدد مفید اور علمی پہلو نظر آتے ہیں ۱۸۹۵ء میں صد سالہ تاریخ تعلیم پر لکچر ۱۸۹۵ء میں ندوہ کی تائید میں معرکۃ الآرا تقریر جس نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ندوہ کے ساتھ دل چسپی پیدا کر دی ۱۸۹۵ء میں ان کی یہ تحریک کہ ہر انگریزی داں مسلمان اپنے مذاق کی کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرے یا انگریزی کتابوں سے ماخوذ کر کے کوئی کتاب تالیف کرے نہایت اہم تھی انھوں نے خود بھی اس پہ عمل کیا اور قانون شہادت پہ ایک شرح لکھی۔ اجلاس میرٹھ منعقدہ ۱۸۹۶ء میں وہ کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری مقرر کیے گئے، اور اسی سال انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے لیجس لیٹو کونسلوں اور میونسپلٹیوں وغیرہ میں انتخاب پہ ایک مبسوط یادداشت تحریر کی اور صوبہ کونسل میں ممبر بھی مقرر ہوئے اور مولانا سے یا کسی اور پروفیسر سے درجہ چھین لینے کا انتہا ہی نہ رکھتے تھے، تمام تعلیمی انتظام پرنسپل کے ہاتھ

میں تھا مولانا شبلی عربی و فارسی کے پروفیسر تھے دینیات کے اسباق کا اُن سے تعلق
نہ تھا اور نہ مولانا نے کسی خط میں سید محمود کی کوئی ایسی شکایت کی ہے اگر ان سے
درجے چھینے جاتے یا ان پر عدم لیاقت کا الزام قائم کیا جاتا تو مولانا کی خودداری کا
تقاضا یہ تھا کہ فوراً استعفیٰ دے دیتے اور ایسی صورت میں کہ حیدرآباد سے کالج
کی مساوی تنخواہ کا وظیفہ مقرر ہو چکا تھا رخصت اور طویل رخصت تو بے معنی بات
ہے، جس کی ضرورت ہی نہ تھی باوجودیکہ مولانا بیک صاحب کی سیاست سے پریشان
تھے اور سخت ناپسند کرتے تھے اور علی گڑھ کی فضا میں اندر سے گھٹن تھی لیکن
۱۸۸۳ء تا ۱۸۹۶ء تحمل و برداشت کی کوئی وجہ بیان نہیں کی جاتی نہ کسی تحریر
میں کوئی شعاع نظر آتی ہے ۱۸۹۷ء کی جنگ رُوم و یونان کے زمانے میں ہی
مولانا نے مسئلہ خلافت پر ایک محققانہ مقالہ علی گڑھ میگزین میں شائع کیا تھا، پھر اس
سال جو رخصت کا زمانہ ہے مولانا کیوں بار بار گھٹنے اور پریشان ہونے کو علی گڑھ جاتے
ہیں "پدر وہ کردن زنداں" کی نصیحت پر صرف ایک سال کی رہائی کی خواہش کس قدر
مہمل بات ہے اور یک سالہ طویل مدتِ رخصت کی نسبت مولانا کا حسبِ ذیل بیان
پوری شعاع ڈالتا ہے کہ مصنف حیاتِ شبلی نے جو وجوہ ظاہر کیے سب غلط ہیں۔۔

"برادرم، تمھارے اجمالی کارڈ کا میں نے جواب لکھ دیا تھا کہ وہ سب
خبریں صحیح ہیں، کیوں کہ میں یہ جانتا تھا کہ وہاں صحیح خبریں پہنچی ہوں گی لیکن
اب معلوم ہوا کہ بعض جگہ غلط خبریں مشہور ہوئی ہیں یعنی یہ کہ شخص معلوم نے
میرے ساتھ دراندازی کی لیکن یہ خبر بالکل بے اصل ہے، واقعہ یہ ہے کہ بک صاحب
اور سید صاحب وغیرہ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں ششماہہ قیام کروں لیکن سید محمود
دفعتاً اس کے مخالف ہو گئے اور اسی اپنی حالت میں بہت سی باتیں اس کے
خلاف کہیں لیکن اس قسم کی ان سے کسی کو اب شکایت نہیں رہی ہر روز یہاں

کے رؤسا اور ٹرسٹیز اور ارکان کالج اسی قسم کی باتوں کے متحمل ہوتے ہیں میں تو اس دن سے آج تک سید صاحب کی کوٹھی پر گیا ہی نہیں، اس دفعہ بہ ظاہر یہاں کی آب و ہوا میں مجھ کو مضرت نہیں معلوم ہوتی باقی ترکِ تعلق اس کی یہ کیفیت ہے کہ میں نے سال بھر کی رخصت اسی تجربے کے لیے لی تھی میں نے دیکھا کہ علی گڑھ میں سال بھر برابر نہیں رہ سکتا وہاں کوئی ایسی دل چسپی نہیں کہ سال بھر تک کام چل سکے اس لیے کچھ یہاں کچھ وہاں کچھ ندوہ اس طرح بسر کرنے کا ارادہ ہے اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ اب کہیں دل نہیں لگتا بالکل خانہ بدوش معلوم ہوتا ہوں، نہیں معلوم کیا ہونا ہے۔" والسلام شبلی۔ (۹ نومبر ۱۸۹۸ء[1] موسومہ مولوی حمید الدین)

ایک اور خط کا اقتباس بھی قابل ملاحظہ ہے جو مولوی محمد اسحاق کے نام کالج سے قطع تعلق کے بعد کا ہے اس میں آیندہ زندگی کا پروگرام بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "لکھنؤ یا علی گڑھ میں بستر ہوگا اور ندوہ یا کالج کا مشغلہ" (۷ اپریل ۱۹۰۱ء)

سرسیّد کی وفات

اس عنوان میں پہلے ان کے اور رفقا کے درمیان جو اختلافات ہوئے ان کو غیر مربوط اور مخلوط واقعات کے ساتھ بہ طور تمہید لکھ کر رقم طراز ہیں

"بااین ہمہ سرسید کے سانحۂ وفات کا جو اثر مولانا پر ہوا اُس کا اندازہ اُس عربی خط سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے سانحہ کے دوسرے دن نواب علی حسن خاں کو بھوپال لکھا۔

نمی دانم حدیث نامہ چون است   ہمی دانم کہ عنوانش بہ خون است

تضعضعت ارکانُ الملة ، اعنی انتقل السید احمد خان بہادرُ

---

[1] کتابت کی غلطی سے ۱۸۹۷ء کی جگہ ۱۸۹۸ء درج ہے۔ سرسید کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہو چکا تھا۔

الی جوار رحمت ربہ و ذالک یوم الاحد ۲۷ مارچ و تفرق شملنا انی لا اقدر علی ان اشتغل بشیٔ الا بعد برھۃ من الزمان، شبلی نعمانی ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء"

(ترجمہ) قومی عمارت کے ستون ہل گئے یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت میں گئے اور یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

"اس موقع پر یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ جس کی مدح انھوں نے کئی دفعہ لکھی اس کے مرثیے میں ایک شعر بھی انھوں نے نہیں کہا مگر واقعات کی روداد آپ کے سامنے ہے اس کو پیش نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ مدح لکھنے والے کا دل اب مرثیہ لکھنے کے زمانے میں بہت کچھ بدل چکا تھا اور جھوٹی شاعری اس کی افتادِ طبیعت نہ تھی۔" (۳۳۱ - ۳۳۲)

اوّل تو بجز ایک قصیدے کے جو مولانا نے ۱۸۸۱ء میں اپنے والد کے ساتھ حاضر ہو کر پیش کیا تھا اور کوئی مستقل نظم سرسید کی مدح میں نہیں لکھی البتہ مختلف اور متعدد قومی نظموں میں بہ سبیل تذکرہ دو دو چار چار شعر آجاتے ہیں۔ دوسرے مرثیہ کا نہ لکھنا تبدیلیٔ قلب کی علامت نہیں ہو سکتی، مولانا نے اپنے منجھلے بھائی مہدی حسن کا بھی مرثیہ نہیں لکھا، جن کی محبت اور مرثیہ نہ لکھنے کی نسبت مصنفِ حیات لکھتے ہیں کہ "مہدی مرحوم نے انتقال کیا تو مولانا نے ہفتوں کسی سے بات چیت نہیں کی فرماتے تھے کہ والد مرحوم آتے تھے اور لوگوں سے ہنستے بولتے تھے تو مجھے تعجب ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ مولوی عبدالسلام نے پوچھا کہ آپ نے ان کا مرثیہ نہیں لکھا تو بولے حواس کب بجا تھے۔" (۲۷۶)

مندرجۂ بالا خط کے الفاظ اگر کوئی معنی رکھتے ہیں تو وہ خط ہزاروں مرثیوں سے

زیادہ جاں گداز اور درد انگیز ہو اور کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اپنے بھائیوں باپ اور دیگر اعزا کی موت کا یہ اثر ہوا ہو کہ بہ حیثیت من الزماں وہ کوئی شغل اختیار کرنے کے ناقابل ہو گئے ہوں ۔

مصنف حیات شبلی نے سرسید اور مولانا کے تعلقات بیان کرنے میں جو واقعہ آفرینیاں کی ہیں یہی ایک خط بجائے خود اُن کا پورا جواب ہو لیکن اگر مصنف کا بیان مان لیا جائے تو کہا جا سکتا ہو کہ جتنے مواقع پر سرسید کی مدح کی اس میں اپنا تقرب ذاتی شہرت اور طلب منفعت مطمح نظر تھی اور اب ان کی موت کے بعد کوئی امید وابستہ نہیں تھی اور حیدرآباد میں کالج کی مساوی تنخواہ کا منصب بھی ہو چکا تھا ، نیز آیندہ توقعات تھیں اسلیے مرثیہ بھی نہیں لکھا ، مولانا نے ۱۸۹۶ء میں سرسید کے ساتھ حیدرآباد گئے تھے ایک نظم میں وقارالامرا کی مدح کی تھی پھر ۱۸۹۵ء میں جب وہ کالج میں آئے تو شاندار قصیدہ لکھا ۱۹۰۱ء میں منصب مقرر ہوا اور اعیان حیدرآباد کے سپاسنامے کے جواب میں جو نظم پڑھی اس میں بھی سروقارالامرا کی مدح تھی لیکن مارچ ۱۹۰۲ء میں جب اچانک طور پر ان کا سانحۂ انتقال پیش آیا تو ایک قطرۂ اشک کا بھی نشان نہیں ملتا حالاں کہ وقارالامرا نے منصب مقرر کرایا اور نظامت علوم و فنون پر مامور کیا ، اگرچہ مولانا کے اولین محسن و مربی سرسید تھے مگر دوسرے محسن سروقارالامرا کے احسان بھی کم نہ تھے ان دونوں کی موت کے بعد ان کو اس طرح بھلا دینا ایک احسان شناس طبیعت کا خاصہ نہیں ہو سکتا ،

زندگی کا دوسرا دور

مولانا شبلی اور ندوہ مولانا کی زندگی اور حیات شبلی کا بڑا تماشہ گاہ "ندوۃ العلما" ہو جس کے لیے انھوں نے کالج کی

ملازمت کے دوران میں ہی سے زین سپس ندوہ وتدریس علوم عرب است کا نعرہ لگایا تھا اور خواجہ حافظؔ نے نصیحت کی تھی کہ سے وقت آن ست کہ پدرود کنی زندان را لیکن سنہ ۱۸۹۸ء میں کالج سے رخصت ہو کر مولانا تو وطن آئے یہاں سے درستیٔ صحت کے لیے کشمیر گئے، وہاں سے واپس ہو کر دوسری شادی کی (پانچ سال ہوئے کہ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا) چند روز نئی زندگی کا لطف وحظ اٹھا کر حیدرآباد گئے اور سر رشتۂ علوم وفنون کی نظامت قبول کر لی البتہ دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء میں پھر ندوہ یاد آیا اور باقاعدہ اعلان کرایا کہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ندوہ کے آستانے پر آ بیٹھوں اور اپنی عمر اسی کی خدمت میں صرف کر دوں (۲۸۶ حیات) لیکن اب بھی تصمیم ارادہ میں کسر رہ گئی تا آں کہ حیدرآباد کے وزارتی انقلاب سے دل برداشتہ ہو کر لکھنؤ آئے اور معتمدی دارالعلوم کا جائزہ لیا، اگرچہ مولانا کو ندوہ کے انتظامی ومالی معاملات سے تعلق نہ تھا لیکن ان کی توجہ اس طرف بھی مبذول ہوئی اور اپنے اثر سے جو محض علی گڑھ کی وجہ سے حاصل تھا بہت کامیابی بھی ہوئی۔

اس زمانے میں تقسیم بنگال کے خلاف ایجی ٹیشن جاری تھا اور دہشت انگیزی بھی وسیع ہوتی جاتی تھی اگست سنہ ۱۹۰۸ء میں حکم ران صوبہ سرجان پرسکاٹ ہیوٹ نے بہ مقام آگرہ دربار کر کے ایک تقریر کی جس میں دہشت انگیزی کے متعلق تنبیہات تھیں، اسی مہینے کے رسالہ الندوہ میں جو ندوۃ العلما کا آرگن تھا مولانا نے ایک اہم مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے" مسلمانوں کی سیاسی ومذہبی زندگی میں یہ مسئلہ دراصل روحِ حیات ہے اس موقع پر اس کے چند فقرات نقل کیے جانے ناموزوں نہ ہوں گے۔

"تاتاریوں نے جب تمام ایران اور عراق پر قبضہ کر لیا تو اس وقت فقہ کی جتنی کتابیں تصنیف ہوئیں سب نے فتویٰ دیا کہ دارالاسلام باقی

رہے گا، غور کرو فقہا نے تاتاریوں کے زمانے میں یہ فتویٰ دیا تھا جو بت پرست تھے اور جن کو مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت نہ تھی آج جب کہ عیسائی حکومت ہے جو اہل کتاب ہیں مسلمانوں کے فرائض مذہبی میں کوئی تعرض نہیں کیا جاتا مسلمان خود عیسائی مذہب کا زور و شور سے سر بازار رد کرتے ہیں تو ایسی حالت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کی وہی پوزیشن ہو گی جو اکبر و جہاں گیر کے زمانے میں تھی اور فقہا کا یہ حکم واجب العمل ہو گا کہ ویجب علینا اتباعھم (درمختار) اور ہم پر ان کی اطاعت واجب ہو گی ...... واقعات مذکورۂ بالا سے تم کو معلوم ہو گا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد زریں سے لے کر آج تک مسلمانوں کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا کہ وہ جس حکومت کے زیر اثر رہتے اُس کے وفادار اور اطاعت گزار رہتے یہ صرف اُن کا طرز عمل نہ تھا بلکہ ان کے مذہب کی تعلیم تھی جو قرآن مجید حدیث، فقہ سب میں کنایتہً اور صراحتاً مذکور ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم — از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس"

ندوہ اور حکومت کے روابط میں یہ کڑی سب سے مضبوط اور اہم کڑی تھی، نتیجے میں نومبر ۱۹۰۸ء تک بلا شرط پانچ سو روپے ماہوار کی امداد منظور کیے جانے کی اطلاع گورنمنٹ نے دی اور یہ وعدہ کیا کہ سرکاری محکمہ مدرسے کے نصاب اور اصول میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کرے گا اور اس امداد کا روپیہ ادب عربی اور انگریزی اور ریاضی وغیرہ مدرسے کی غیر مذہبی تعلیم میں خرچ ہو گا۔ (۴۷۸)

اس کے علاوہ حکومت نے بہت رعایت کے ساتھ تعمیر دار العلوم کے لیے ایک خوش منظر قطعہ زمین بھی عطا کیا اور ۲۸ نومبر کو حکمران صوبہ نے سنگ بنیاد بھی نصب کیا۔

اس رسم کے متعلق مصنف حیات شبلی لکھتے ہیں کہ

"اس زمانے کے حالات کے مطابق یہ مناسب معلوم ہوا اس مدرسے کا ظاہری سنگِ بنیاد یو پی کے گورنر سر جان پرسکاٹ ہیوٹ رکھیں تاکہ اودھ کے تعلقہ داروں کی بدگمانی دور ہو" (۱۸۴ حیات)

اس سلسلے میں آئندہ اوراق میں تحریر کرتے ہیں کہ

"مولانا مرحوم نے اس جلسے کا حال خود اپنے قلم مسرت رقم سے لکھا ہے اس لیے ہم یہاں انھی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں":

"بگزر ازیں حرف و مکرر مپرس — خواب خوشی دیدم و دیگر مپرس
تندمی بود و خرابم ہنوز — دیدۂ من باز و بہ خوابم ہنوز

ہماری آنکھوں نے حیرت فزا تماشا گاہوں کی دل فریبیاں بارہا دیکھی ہیں جاہ و جلال کا منظر بھی اکثر نظروں سے گزرا ہے کانفرنسوں اور انجمنوں کا جوش و خروش بھی ہم دیکھ چکے ہیں وعظ و پند کے پُر اثر جلسے بھی ہم کو متاثر کر چکے ہیں لیکن اس موقع پر جو کچھ آنکھوں نے دیکھا وہ ان سب سے بالاتر ان سب سے عجیب تر ان سب سے حیرت انگیز تھا، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بہ دوش نظر آتے تھے یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علمائے اسلامی فرماں روا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی درس گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درس گاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا (مسجد نبوی کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا) غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش اور کج کلاہ سب جمع تھے۔ آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں" (۱۸۴ حیات)

مگر مصنف کے الفاظ "اس زمانے کے حالات کے مطابق، سنگِ بنیاد" اگرچہ لغت کے اعتبار سے تو معنی رکھتے ہیں مگر واقعہ اور محل و موقع کے لحاظ سے جس قدر مہمل ہیں ان پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں اور ندوہ کے تعلقہ داروں کی بدگمانی بھی یہاں ایک مہمل اضافہ ہے، حالاتِ جلسہ جو قلمِ مسرت رقم سے لکھے گئے ہیں ان کی اس تمہید کا (جو منقول ہے) زور بیان دیکھنے کے ساتھ انقلابِ خیالات اور بالتخصیص اس جوش کو دیکھیے جو ایسے مفکر سیاسی اور مذہب کے شیدائی کے قلم سے ٹپکا پڑتا ہے جو سرسیّد کی سیاست اور وفاداری سے بیزار تھا، پھر ایک عیسائی فرماں روا کے سامنے مقدّس علما کا ادب سے خم ہونا بھی دیکھیے، جن علما میں خود مولانا بھی تھے جن کی نسبت مصنّف کا ادّعا ہے کہ اُن کی گردن بڑے سے بڑے جبّاروں کے سامنے نہیں جُھکی یہاں ایک گورنر کے سامنے نہ صرف اپنی گردن جُھکا دی بلکہ بڑے بڑے علما اور جانشینانِ پیغمبرؐ کی گردنیں جُھکوا دیں۔ مگر اس تمام بیان میں جو پانچ صفحات میں ہے سپاس نامے اور جواب کا چند سطروں میں ملخص یا اقتباس بھی نہیں جو روح و جانِ سخن، اپنی نوعیت میں منفرد اور مولانا کے سیاسی و علمی و جذبۂ مذہبی کی یادگار ہے، سپاس نامہ عربی میں تھا، اس میں ندوہ کی تاریخ، مقاصدِ تعلیم، معطیان اور سول حکّام کی شکرگزاری کے بعد عرض کیا تھا کہ

"حضور نے ایک مذہبی درس گاہ کا سنگِ بنیاد نصب کرنے سے اس سماحت اور بے تعصبی کی ایک اور مثال قائم کی ہے جو انگریزی قوم کا خاصا اور انگریزی گورنمنٹ کا عمود حکومت ہے۔"

اس کے بعد مسلم قومیت کی تعریف، زمانۂ حال کے علما کی تنگ خیالی، پست خیالی، جزئی مذہبی تنازعات ندوہ کی دیگر مدارس کی نسبت شانِ امتیاز دکھا کر لکھا تھا کہ

"ہمارے طلبا تعصب، تنگ خیالی اور بے ہودہ جوش و خود سری سے بری

ہیں یہ ممکن ہے کہ ہمارے طلبا انگریزی نوکریوں کے حاصل کرنے کے قابل نہ ہوں یہ امر یقینی ہے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم ایسا گروہ پیدا کرے گا جو آج کل کے فتنہ زا اور پر جوش خیالات کے اس گروہ سے بچنے کے قابل ہوں گے جو خداوندی اور انسانی دونوں حکومتوں سے سرتابی کے لیے آمادہ ہے یہ ایسا گروہ ہوگا جو بزرگوں کا ادب کرنے والا، ہم سایہ قوموں کا دوست، عام لوگوں کا ہوا خواہ اور گورمنٹ کا وفادار ہوگا۔"

ہز آنر حکم رانِ صوبہ نے اپنے جواب میں مقاصد ندوہ اور نصابی تغیرات، انگریزی ادب وغیرہ کے شمول وغیرہ کی تعریف کی اور اس کی اعانت و حمایت پر اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "آپ پولیٹکل یعنی سیاست کے معاملات سے احتراز کرتے ہیں اور ندوہ کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ آپ پولیٹکل معاملات سے کچھ تعلق نہ رکھیں گے۔ بجز اس حالت کے کہ حکومت خود کسی مسئلے کی نسبت آپ کی رائے دریافت کرے مجھ کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے گورمنٹ برطانیہ کی نسبت خیالات وفاشعاری کا اظہار ایسے صاف لفظوں میں کیا ہے کہ ان کے معنوں میں شک نہیں ہو سکتا مجھ کو یقین ہے کہ آپ کا ندوہ اپنا اثر لوگوں پر اس طرح ڈالے گا کہ اس سے حکام کی تائید ہو اور شورش و فساد اور خیالات بد اندیشی کی مخالفت کی جائے ..... ملک ہند میں گورمنٹ برطانیہ نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ بہ لحاظ مذہب کسی گروہ کی جانب داری نہ کرے گی مگر اس اصول سے اس بات میں خلل نہیں آتا کہ آپ کی سی جماعت متعلقہ علوم مذہبی کو اس غرض سے اعانت نہ دی جائے کہ وہ مذہبی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم بھی دیا کرے بہ شرطے کہ وہ امداد جو گورمنٹ سے ملے محض دینوی تعلیم کے اغراض کے لیے کام میں لائی جائے اور مذہبی تعلیم اور دُنیاوی تعلیم میں صاف فرق کر دیا جائے اور جو درجے دینوی تعلیم کی غرض سے

مقرر کئے جائیں بروقت معائنہ کرنے دیا جائے ان خیالات کے لحاظ سے اور اس
اُمید سے کہ آپکے دارالعلوم میں ایسے عربی وفارسی کے عالم دست یاب ہوں گے
جو اسکولوں میں پڑھانے کے کام کے لیے مفید ہو سکتے ہیں گورمنٹ نے یہ تجویز
کر لیا کہ آپ کو وہ زمین دے جس پر اس وقت ہم سب موجود ہیں...... یہ معلوم
ہونے سے بھی مجھ کو بڑی خوشی ہوئی کہ لکھنؤ کے سول حکّام آپ کے ندوہ سے توجہ
اور ہمدردی کے ساتھ سلوک کرتے رہے ہیں۔

مصنّف نے اس روداد کے بیان میں اکبر اور مولانا شبلی کی نظم کو جگہ دی مگر
مولانا حالی کی نظم کا ذکر تک نہیں کیا اور علی گڑھ پر (بجائے شکریہ) یہ تعریض کردی
کہ اس جلسے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ علی گڑھ پارٹی کے ارکان آفتاب احمد خاں،
ڈاکٹر ضیار الدین احمد اور کالج اور کانفرنس کے دُوسرے ارکان جو ابھی تک ندوہ کے
کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ شریک اجلاس ہوئے۔
(۴۸۶ حیات) یعنی علی گڑھ والے ندوہ سے الگ الگ رہے تھے۔ مگر وہ سب
مع مولانا شیروانی کے علی گڑھ اور کانفرنس کے ہی ارکان تھے جنھوں نے ہر موقع پر
اور خاص کر کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ندوہ کی پُرزور تائید کی تھی خود مولانا بھی عرصے
تک اسی زمرے میں تھے اور کالج و کانفرنس کا سکریٹری (نواب وقار الملک) ندوہ کے
زمرۂ ارکان میں تھا، مصنّف نے اس اہم واقعے کو بھی نظر انداز کر دیا کہ کالج کے طلبا
کی ایک جماعت بھی اس جلسے کی شرکت کے لیے آئی تھی جس کو طلبائے ندوہ نے
مخصوص طور پر مدعو کر کے عہدِ مواخات باندھا۔

مولانا کی ندوہ سے مسلسل ۱۸ سال تک وابستگی کے بعد (جس میں آٹھ سال
ان کی سرگرمانہ مساعی مشکور کا زمانہ بھی شامل ہو) الگ ہونا یعنی ۱۹۱۳ء میں معتمدی
سے استعفا اور اس کے اسباب نیز بعد کے واقعات اُن کی زندگی کے سانحاتِ عظیم

ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ مصنف حیات شبلی نے اس بیان میں کہاں دیانت و راستی سے کام لیا ہے لکھتے ہیں کہ

"جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جاتی تھی اور اس کا کام آگے کو بڑھتا جاتا تھا اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بنتا جاتا تھا یعنی ندوہ کی کثرت میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی تھی، گو یہ واقعہ تھا مگر واقعے کو واقعہ سمجھ کر برداشت کرنا ہر انسان کا کام نہیں، اس لیے رشک و حسد نے بے اعتمادی اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کیا لیکن یہ کہنا کہ مولانا کے سوا ان کے تمام دوسرے مخالف رفقا اخلاص اور حسن نیت سے خالی تھے ایک بڑی جرأت ہے یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ مولانا کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سولہ برس علی گڑھ میں بسر ہوا تھا اور علی گڑھ تحریک سے ان کی وابستگی شہرت عام رکھتی تھی لیکن یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کو اس وابستگی کے باوجود اس تحریک کے بعض حصوں سے سراسر اختلاف تھا اسی بنا پر وہ ندوہ میں شامل ہوئے تھے مگر عام علما اور ان کے معتقد ارکان یہی سمجھتے تھے کہ یہ علی گڑھ تحریک کے آدمی ہیں اور علی گڑھ چھوڑ کر ندوے میں اسی لیے شریک ہیں کہ اس مذہبی تحریک کو برباد کر دیں[1] (۴۲۷ و ۴۲۸ حیات)..... جب مولانا نے ندوہ میں قیام کا ارادہ کیا تھا اس وقت نواب محسن الملک نے کہا تھا کہ ندوہ کی اس کس مپرسی کی حالت میں تو کوئی شخص آپ کا مزاحم نہ ہوگا لیکن جب ترقی کے آثار نمایاں ہوں گے تو دفعتاً تمام مولوی

---

[1] مضمون بر وفات مولانا شبلی نوشتہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی۔

آپ پر ٹوٹ پڑیں گے اور آمادۂ مخالفت ہوں گے یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور جلسۂ سنگِ بنیاد ہی میں اس کی بنیاد پڑ گئی مولوی خلیل الرحمان صاحب سہارن پوری مرحوم جو پہلے رسماً نائب ناظم تھے اور اب کسی ناظم کی عدم موجودگی میں اپنے کو قائم مقام ناظم سمجھتے تھے بہ طورِ حریف کے مولانا کے مقابل کھڑے ہوئے اور اس کی ابتدا ایک خط سے ہوئی جس میں مولانا نے ان کو یہ لکھا تھا کہ اس وقت ندوہ کا کوئی ناظم نہیں (حالاں کہ مولوی خلیل الرحمان صاحب مرحوم اپنے آپ کو ندوہ کا قائم مقام سمجھتے تھے) بہر حال اس کے بعد مولوی خلیل الرحمان صاحب نے اپنی مخالفت کا اظہار (جس کو کون کہہ سکتا ہے کہ نیک نیتی پر مبنی نہ ہوگا) مختلف پردوں میں کیا" (۶۳۹ حیات)

ابھی تک تو مولانا شبلی کا اختلاف علی گڑھ کی تحریک سے بیان کیا جاتا رہا اب بعض حصے اختلافی بن گئے مگر مصنّف نے ان کی تشریح نہیں کی محض مغالطے کے لیے صیغۂ جمع استعمال کر دیا، یہ امر کہ عام علما اور ان کے معتقد ارکان مولانا کی شرکت کو ندوہ کی بربادی پر محمول کرتے تھے واقعات اس کی تردید کرتے ہیں، مولانا پہلی مرتبہ ۱۸۹۴ء میں شریکِ جلسہ ہوئے اور ایک دستور العمل پیش کیا جس پر تین جید علما نے غور کیا عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدارس کی تنظیم کی تجاویز پیش کیں، ترتیب نصاب کی مجلس میں من جملہ بارہ ارکان کے ایک مولانا بھی تھے، ۱۸۹۵ء میں ناظم کی طرف سے روئداد سنائی فرائض علما پر تقریر کی اور مجوزہ دار العلوم کا خاکہ جو انھوں نے مرتب کیا تھا منظور ہوا۔

۱۸۹۶ء کے اجلاس میں مجلس دار العلوم کے قواعد مرتب کر کے پیش کیے اور پٹنہ کے وفد علما میں شریک ہوئے ۱۸۹۷ء میں دار العلوم کی ضرورت پر پُر زور تقریر کی۔ مارچ ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ کو جو وفد دار العلوم کے لیے مناسب جگہ تجویز

کرنے گیا اس میں شریک تھے، یہ سب علی گڑھ کے زمانے میں ہوا ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۱ء
بعض مشاغل، خانگی معاملات، عقد، حیدرآباد کی ملازمت کی وجہ سے کسی اجلاس میں
شریک نہ ہو سکے، یہی زمانہ ندوہ سے حکومت کی بدگمانی کا تھا ۱۹۰۱ء میں علما کی
مجلسِ خاص میں نصاب کے مسئلے پر طول طویل بحثیں ہوئیں اور مولانا کی جیت ہوئی ۱۹۰۳ء
میں اگرچہ شریک اجلاس نہ تھے لیکن بالاتفاق معتمد دارالعلوم منتخب ہوئے اور طے ہوا
کہ مولانا سے درخواست کی جائے کہ وہ لکھنؤ آکر قیام کریں۔

۱۹۰۴ء میں ایک جلسے کی صدارت کی اور نصاب کا اہم مسئلہ طے ہوا فروری
۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کی معتمدی کا جائزہ لیا، حیاتِ شبلی ہی میں یہ گیارہ سال کی
روئداد ہے جس میں کوئی موقع اور کوئی وہم بھی اس بات کا نہیں کہ علما سمجھتے ہوں کہ
مولانا ندوہ کی بربادی کے لیے شریک ہوئے بلکہ روز بروز ان کی اہمیت و
ضرورت بڑھتی جا رہی ہے، پھر اس مدت میں چھ سال تو ایسے ہیں کہ وہ علی گڑھ سے
جدا ہو چکے ہیں البتہ ۱۸۹۵ء کی روئداد سے جو مولانا نے ہی لکھی ہے یہ پتہ تو چلتا
ہے کہ کانفرنس میں ندوہ کے متعلق جو تائیدی رزولیوشن پاس ہوا اس پر بعض لوگوں نے
بدگمانی کی اور سمجھا کہ اس کی ہم دردی کی تہ میں کچھ نہ کچھ ہے مگر مولانا نے اپنی نسبت کسی
شک کا اشارہ نہیں کیا، پھر تو ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۳ء مولانا ہی مدار ندوہ نظر آتے ہیں

مصنفِ حیات نے اپنی تائید میں حاشیے پر مولانا شیروانی نواب صدر یار جنگ
کے ایک مضمون کا جو مولانا شبلی کی وفات[۱] پر تھا حوالہ دیا ہے اور احبابِ علما کے ذکر
میں صفحہ ۸۰۰ پر اس کا ایک اقتباس (ابتدا کا اہم حصّہ حذف کر کے اور آخر میں کچھ اپنی
طرف سے بڑھا کر پیش کیا ہے، ہم اس اقتباس کو اس اہم حصّے کے ساتھ نقل کرتے ہیں
اور اضافے کو علاحدہ دکھاتے ہیں۔

۱؎ یہ مضمون با اقساط جنوری ۱۹۱۵ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوا ہے۔

حصۂ محذوف

"ندوۃ العلما کے ساتھ علامہ شبلی کو ابتدائے قیام مجلسِ مذکور سے تعلق تھا اور وہ ان چند مخصوص ارکان میں تھے جنھوں نے ندوہ کے مقاصد کو پورے طور پر سمجھ کر اس کی کام یابی کو نصب العین قرار دیا تھا مولانا سید محمد علی ناظم اوّل کی دوربیں اور مردم شناس نظر نے ابتدا سے یہ امر محسوس کر لیا تھا کہ ندوہ کے بعض مقاصد ایسے ہیں جن میں علامہ شبلی کی رہبری کی ہمیشہ ضرورت ہوگی دار العلوم کی اسکیم انھی کے دماغ کا نتیجہ تھی، جو رسالہ ندوۃ العلما نے اس کے متعلق شائع کیا وہ انھیں کے قلم کا لکھا ہوا تھا جب تک مولانا سید محمد علی کی نظامت رہی مختلف خیال کے ارکان اپنے دائرے میں کام کرتے رہے اور باہم تصادم نہ ہوا مولانا کی علاحدگی کے بعد پھر کوئی ایسا ناظم نہ ملا جو مختلف الخیال کے ارکان سے کام لے سکتا۔"

حصۂ منقول

"علامہ شبلی چوں کہ سالہا سال کالج میں رہے تھے ایک حد تک ان کے خیالات آزاد تھے علما کے مروجہ طریقوں کو وہ لوازم دین خیال نہیں کرتے تھے اعتراض کرنے میں بے باک تھے ان کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور اور اس کے آثار تھے لہذا متاخرین کے انداز کے زخم خوردہ نہ تھے یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قدیم علما کو ان کی جانب سے شبہات تھے بعض کا عرصے تک یہ خیال رہا کہ وہ کالج کے سفیر بن کر ندوہ میں آئے تھے تاکہ یہاں بھی الحاد کا رنگ جمائیں خلاصہ یہ کہ آخر وقت تک علامۂ شبلی قدیم طبقے کے علما میں شیر و شکر نہ ہو سکے۔" (۸۰۰ حیاتِ شبلی)

حصہ زائد

"تاہم اس قدر کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علامۂ شبلی کی ذات واسطہ تھی قدیم و جدید

سوسائٹی کی صلح و آشتی کا لیکن افسوس کہ مذکورۂ بالا اختلاف نے ان کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیا۔"

(بقیہ مضمون کی اصل عبارت یہ ہے کہ) "اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی خدمات نے ندوۃ العلماء کے قالب میں ایک تازہ روح پھونکی بہت سے مرحلے طے کیے لیکن جو کامیابی حاصل ہونی چاہیے تھی وہ باہمی تصادم خیالات نے نہ ہونے دی ہماری بہت سی محرومیوں میں ایک یہ بھی ہے۔"

دیکھیے کہ مصنف نے محولہ بالا مضمون میں کس قدر کھلی قطع و برید اور اضافہ کو جائز کر دیا اور مفہوم کتنا بدل دیا، رسماً نائب ناظم بھی ایک نئی اصطلاح ہے یہ عہدہ اسی لیے وضع ہوا ہے کہ اگر ناظم (جناب) کسی وجہ سے نہ ہو تو نائب اس کی جگہ کام کرے تمام دستوری کمیٹیوں میں نائب کا عہدہ عموماً رکھا جاتا ہے، مولوی خلیل الرحمان اپنے کو بجا طور پر قائم مقام سمجھتے تھے خود مولانا نے ان کو چیلنج کیا اس نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ" میں وزیر بن کر تو کام کر سکتا ہوں بادشاہ بن کر نہیں۔ (خط موسومہ شیروانی سنہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۹ مکاتیب)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سادات بارہہ کی سی وزارت چاہتے تھے۔

ابتداءً مولانا اور ارکان ندوہ کے مابین جو کچھ اختلاف تھا وہ صرف نصاب تعلیم کے متعلق تھا اور جن ارکان مخالف میں مولانا شیروانی بھی تھے، اس اختلاف کے متعلق مصنف حیات شبلی نے اس مراسلت کے جو ان دونوں مولاناؤں کے مابین ہوئی ہے اقتباس و حوالے بھی دیے ہیں، لیکن ایک خط کو جو تمام معاملے پر روشنی ڈالتا ہے نظر انداز کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ

"کسی اور کی جو نیت ہو وہ ہو لیکن میں ندوہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں تو صرف اس لیے کہ ایک مذہبی خدمت انجام دوں دنیوی جاہ و اعزاز نام وری

شہرت کے لیے علی گڑھ کا میدان بہت اچھا ہی ابھی ابھی نواب محسن الملک
کا خط آیا کہ لفٹننٹ گورنر حال نے میرے متعلق فیصلہ کر دیا اور رائے دی کہ
چاہو تو علی گڑھ ان کو بلالو اس صورت میں مالی فائدہ بھی ہی اور شہرت بھی
باوجود اس کے اگر ندوے میں آنا چاہتا ہوں تو اس میں کیا خود غرضی ہو سکتی
ہی باوجود اس کے میرے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہی کہ ایک بار میں نے ندوہ
میں قیام کر کے فہرست اسمار طلب کی کہ لوگوں کے نام مُراسلت متعلق ندوہ
کرسکوں باوجود اصرار کے ناظم صاحب اور مددگار صاحب نے تعطل کیا
اور بڑی مشکل سے بارہ نام عنایت کئے، نصاب تعلیم پر میں برسوں غور کر چکا
ہوں مصر کی اصلاحات کو دیکھتا رہتا ہوں وہاں سے جدید کتابیں جو اب
تک کسی کے پاس نہیں پہنچیں ان کو منگوایا ہی باوجود اس کے اس کمیٹی سے
خارج رکھا گیا ہوں رسالے میں مجھ کو دخل نہیں تو کیا مجھ سے دُعا گوئی اور
طبل نوازی کا کام لینا مقصود ہی مجھ کو یہ پسند نہیں کہ ایک مذہبی مجلس میں
شریک ہوکر جوڑ توڑ کروں اپنا اثر بڑھاؤں مخالف کو شکست دوں اس
جنت سے تو دوزخ بھلی اس مردی سے نامردی بہتر، مجتبیٰ، ہم مسلمانوں
کی فطرت خدا نے بالکل تباہ کر دی ہی آپ کیا کریں گے اور کوئی کیا کرے گا
جس کا جی چاہے سکریٹری مددگار ناظم وغیرہ وغیرہ بن لے اور اس عزت
پر اترائے باقی کام ہونا تو یہ قسمت ہی میں نہیں پھر کیا فائدہ (۲۲۴ شیروانی
۶ ستمبر ۱۹۰۶ء)

انھی سنین میں متعدد خطوط اسی مضمون اور اسی قسم کے اور بھی ہیں تاہم مولانا
کی جمعیت ہوتی ہی اور ندوے میں اکر دہ نیا نصاب بھی جاری کر دیئے ہیں، اور جیسا
کہ مصنف کا بیان ہی ابتدائے مخالفت جلسۂ سنگ بنیاد ۱۹۰۸ء سے ہوئی ہی اس

مرحلے میں بھی علی گڑھ تحریک اور ندوہ کی بربادی کا کوئی واہمہ نہیں بلکہ بقول مولانا شبلی "اصل یہ ہے کہ منشی احتشام علی صاحب اور مولوی خلیل الرحمان صاحب بلکہ مولوی عبدالحیٔ صاحب کو بھی کسی قدر یقین ہے کہ میں ان لوگوں کے اختیارات میں دست اندازی کرتا ہوں اور ان کے کرنے کا کام خود کرتا ہوں اور اس طرح وہ نمایاں نہیں ہوتے" (شیروانی ۲۰ ستمبر ۱۹۱۲ء ۱۴۱ ۶حیات ص ۸۷)

ان تمام واقعات کو بار بار پڑھیے اور دیکھیے کہ کہیں بھی یہ خفیف نشان پایا جاتا ہے کہ اس مخالفت کا باعث علی گڑھ یا اکثر علما اور ان کے معتقدین کا کوئی خیال تھا بلکہ صاف ظاہر ہے اور مصنف بھی پردہ نہیں ڈال سکے کہ اصل وجہ اقتدار و اختیار کی ہوا و ہوس اور کش مکش اور رشک و حسد ہے مگر علی گڑھ پر ہی تان توڑی گئی ہے۔

یہ بات ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان وجوہِ اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی مصنف قدم قدم پر مخالف رفقا کے اخلاص اور حسنِ نیت کا بھی اعتراف کرتے جاتے ہیں۔

نواب صدر یار جنگ مولانا شیروانی نے اپنے مضمون میں الحاد کا رنگ جمانے کی بدگمانی کا ذکر کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ "بعض کا عرصے تک یہ خیال رہا" ممکن ہے کہ ابتدا میں عرصے تک رہا ہو مگر واقعات مابعد بتا رہے ہیں کہ ان بعض کا بھی یہ خیال جا رہا تھا، البتہ پہلی مرتبہ ۱۹۱۲ء میں طلبائے ندوہ کی مذہبی حالت کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن کی تجویز ہوئی اور مخالفت نے طول پکڑا تو مولوی خلیل الرحمان کے رفقا نے الحاد کا حربہ استعمال کرنا چاہا، مولانا نے ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کے خط موسومہ مولانا شیروانی میں لکھا ہے کہ

"کمیشن کی شہرت نے بہت بڑا اثر پیدا کیا اول تو تمام شہر میں مشہور رہی کہ فلاں شخص علیحدہ کر دیا گیا دوسرے اس کی پختگی کے لیے شاہ سلیمان صاحب وغیرہ ہر جگہ یہ چرچا پھیلا رہے ہیں کہ فلاں شخص کی نسبت تمام ہندستان میں بدعقیدگی کی

الحاد کا شبہ عام ہو گیا ہو اس لیے اب اُن کے انتساب سے ندوے کو نقصان پہنچ رہا ہی اور پہنچے گا" نمبر۲ (مکاتیب شبلی)

یہ وہ زمانہ ہی جب کہ مولانا شبلی الکلام و علم الکلام لکھ چکے تھے اس کمیشن میں خود مولانا کی شہادت ایک سوال تھا جس کو وہ اپنی توہین سمجھتے تھے اس کے متعلق مولانا شیروانی کو انھوں نے دو خط مفصل لکھے مصنف حیات شبلی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے صرف اُن کے حوالے پر اکتفا کی تاکہ واقعے کی صورت حال پہ نقاب پڑا رہے اور جن کے اخلاص اور حسن نیت پہ عقیدہ ظاہر کیا گیا ہی اس میں تزلزل نہ ہو، ان خطوط میں ۱۲ ستمبر ۱۹۱۱ء کا خط نمبر ۶ ۸ مندرجہ مکاتیب شبلی یادگار ہی، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

"بے شک میں اس وقت اس کارروائی پر راضی ہو سکتا ہوں جب اس کے ساتھ او معتمدین پر کمیشن بیٹھے ہیں اس کو قطعاً ثابت کر سکتا ہوں کہ فلاں صاحب صبح کی نماز نہیں پڑھتے فلاں صاحب نے اپنی غفلت سے اس وقت تک ہزاروں روپیہ لوگوں پر ضائع کر دیا ہی یعنی لوگوں سے کمرے کی تعمیر کے لیے روپیہ دیا تھا وہ تعلیم پر صرف کر دیا گیا وعلیٰ ہذا فلاں صاحب نے وقف کر کے اپنی جائداد دارالعلوم کو دی اور اب تک رکن ندوہ ہیں مکان دارالعلوم کا روپیہ ندوہ ادا کر چکا باوجود اس کے وشاویز واپس نہیں کرتے اور اسی وجہ سے باوجود اس کے کہ دو دفعہ جلسۂ انتظامیہ میں منظور ہو چکا کہ مکان موجودہ فروخت کر ڈالا جائے وہ فروخت نہیں کرتے .... اس میں کچھ شبہ نہیں کہ طلبا میں تقدس کا اثر نہیں ...... اس کی وجہ میں نے بہت سوچا اس کے سوا کوئی نہیں کہ ابتدا سے آج تک کوئی پرنسپل مقدس اور ریا اثر نہیں ملا۔ ایک زمانے میں مولوی فاروق صاحب مرحوم تھے وہ خود بے پڑھے تھے

مولوی ۔۔۔۔۔۔صاحب خود پابند تھے لیکن اثر کچھ نہ تھا خود اُن کا لڑکا مولوی ۔۔۔۔۔۔ڈاڑھی ترشواتا تھا اور وہ کچھ نہ کہتے تھے اس کی نماز فجر نہ پڑھنے کی میں نے شکایت کی تو فرمایا رات کو مطالعہ زیادہ دیکھتا ہے اس لیے صبح کو سوجاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ میں جب حیدرآباد سے آیا تو دیکھا کہ دارالاخبار (ریڈنگ روم) میں طلبا نے نواب محسن الملک وغیرہ کی تصویریں لگا رکھی ہیں، نماز نہ پڑھنے پر گوشت کا پیالہ بند کیا جاتا تھا لیکن ہر روز دس پانچ بند رہے۔"

غرض اس تمام چپقلش کے بعد کرنل عبدالمجید خاں (پٹیالہ) نے مصالحت کرادی یہ علمائے کرام باہم بغل گیر ہوئے (۶۴۳) لیکن کچھ ہی عرصے تک سکون رہا تھا کہ رسالہ الندوہ کے ایک مضمون سے پھر شدید تصادم ہوا، بقول مصنف

"اس وقت جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑا اشتعال تھا مولوی عبدالکریم صاحب نے اس موقع کی مناسبت سے اپنے پہلے ہی مرتبہ پرچے میں جو ۱۹۱۲ء کے آخر میں جون ۱۹۱۲ء کے مہینے میں چھپا جہاد کے فضائل و مناقب پر ایک طویل مضمون شائع کیا اس زمانے میں لفظِ جہاد کے نام کی ہیبت جو انگریزوں اور مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اس کا تصور بھی آج مشکل ہے اور ندوہ ابھی ابھی ان سیاسی الزاموں سے حکومت کی نگاہ میں بری ثابت ہوا تھا اس مضمون کی اشاعت نے ندوہ کے کارکنوں کو گھبرا دیا مولانا نے ۲۸ر جنوری ۱۹۱۳ء کو معتمدین اور مقامی ارکان کو بلاکر صورتِ حال پیش کی سب کی متفقہ رائے سے وہ چند روز کے لیے معطل کردیے گئے اور اس کارروائی کی اطلاع ڈپٹی کمشنر کو دی گئی یہ کارروائی اگرچہ معتمدین اور مقامی ارکان کے اتفاقِ رائے سے کی گئی تھی لیکن مخالفین نے اخبارات میں جب شبے ۔ وغل

۱؎ اصل کتاب میں نقاط ہیں۔

کیا تو ان میں سے متعدد ارکان نے اپنی برات ظاہر کی اور آخر چند دیگر ارکان نے جن میں مقامی وکلا تھے ۹ مارچ ۱۹۱۳ء کو ایک جلسۂ انتظامیہ کر کے اس قانونی نقص کی بنا پر اس کو منسوخ کرایا کہ اس معطلی کا قانونی اختیار نہ معتمدین کو تھا نہ صرف مقامی ارکان کو"۔ (۶۴۴)

مولوی عبدالکریم کے متعلق بھی مصنف کا ریمارک ہے کہ "موصوف اچھے خاصے طباع اور ذہین تھے مگر افسوس ہے کہ اس ذہانت کا رُخ دوسری طرف تھا وہ بہت جلد دوسروں کے حلقۂ اثر میں آگئے جنھوں نے ان کو فضل و کمال میں مولانا شبلی کا مدِ مقابل بنا کر کھڑا کیا"۔ (۶۴۴) مصنف نے اس واقعہ کو مکاتیب شبلی حصۂ دوم صفحہ ۸۵ کے حاشیے پر بھی لکھا ہے کہ "مولوی عبدالکریم دارالعلوم کے ایک لائق مدرس تھے مولانا کے بعد الندوہ کی اڈیٹری مقامی ارکان نے سپرد کی تھی جس کے وہ حقیقت میں اہل نہ تھے اسی اثنا میں انھوں نے جنگ طرابلس کے زمانے میں جب مسلمانوں کے جذبات بے انتہا برافروختہ تھے الندوہ ج ۹ نمبر ۶ میں جہاد پر ایک غیر مآل اندیشانہ مضمون لکھا جو گو اس وقت کے عام جذباتِ اسلامی کے مطابق تھا لیکن احکامِ اسلامی کے مطابق نہ تھا"۔

مکاتیب اور حیات کے بیانوں میں جو تضاد ہے اس پر کسی ریمارک کی ضرورت نہیں، لیکن حیات میں یہ نیا واقعہ پیدا کیا گیا کہ جہاد کے نام کی ہیبت جو انگریزوں اور مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی، حالاں کہ اس جہاد وہیبت کا پتہ نہ تھا اور مسلمان ڈھڑلّے اور آزادی سے مجاہدین ترک و عرب کی ہمدردی میں جلسے کر رہے تھے اور بعض مواقع پر تیز زبان بھی استعمال کی گئی، پھر اس ہیبت جہاد میں اخبارات کا شور و غل کیا معنی، اور اس پر مستزاد یہ کہ دیگر ارکان اور مقامی وکلا بے خوف ہو کر معطلی کے حکم کو منسوخ بھی کر دیتے ہیں پہلے یہ مضمون غیر مآل اندیشانہ اور احکام

اسلامی کے غیر مطابق تھا مگر اب متوقع کے مناسب اور مبنی بر فضائل و مناقب ہو گیا
بہرحال جو کارروائی مولانا نے کی تھی اور ناجائز قرار دی گئی وہی بالآخر دوسری
جماعت نے بھی کی،

مولانا کے خلاف جو شورش پھیلائی گئی اس کے متعلق بھی خود مصنف کو مولانا
نے جو ہدایت کی وہ اگرچہ حیات شبلی میں نہیں ہے لیکن مکاتیب میں ہے کہ "اشرار کا جواب
لکھنا ضروری ہے ان منافقین نے ایک طرف تو حکام میں یوں شرح رڈئی پیدا کی کہ مولوی
عبدالکریم کی معطلی پر ہم نے لوگوں کو آمادہ کیا اور مجازی حاصل کی دوسری طرف مجھ کو
قوم میں سخت بدنام کیا اور اپنی برأت کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں اور یہ سب کو یقین
دلایا کہ ہم نے جو کچھ کیا شبلی کی دھمکی سے کیا" (خط ۱۲۴ موسومہ سلیمان) کیا یہ وہی شرار
نہیں جن کے حسن نیت و اخلاص کا اعتراف ہے۔

مولانا کے استعفے کے بعد اسٹرائک اور تحریک اصلاح ندوہ بھی مولانا کی
زندگی میں ایک بڑا سانحہ نظر آتی ہے لیکن مصنف حیات شبلی نے اس میں بھی اخفائے
واقعات کی حیرت انگیز مثال پیش کی ہے،

مولانا نے جولائی ۱۹۱۳ء میں بمبئی سے استعفا بھیجا بعض دوسرے ارکان ندوہ
اور معتمدین بھی مستعفی ہو گئے، ۱۸ تا ۲۰ جولائی کے جلسہ انتظامیہ میں یہ استعفے منظور
ہوئے مولانا خلیل الرحمان مستقل ناظم مولوی سید عبدالحئی اور منشی احتشام علی نائب
ناظم مقرر کیے گئے، "چوں کہ مولانا صرف ندوۃ العلما کی بہبودی اور اصلاح کے خواہشگار
تھے اس لیے اس یکسوئی میں ان کو ندوۃ العلما کے فوائد نظر آئے۔ مولانا کے استعفے
کی خبر جب طلبا کو معلوم ہوئی تو ان کو سخت افسوس ہوا ایک جلسہ کر کے تار بھیجے فرداً
فرداً خط لکھے لیکن مولانا نے عہدے کی ذمہ داری لینے سے انکار کیا لیکن اقرار کیا کہ
معمولی رکن کی حیثیت سے زندگی کا مقصد ندوے کی خدمت ہے (۹۴ ۶) ۱۲ر جولائی

کو طلبا کے نام ایک خط لکھا پھر مدرسِ اعلیٰ مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی اور حضرات مدرسین کے جواب میں خط لکھا "آپ صاحبوں کی ہمدردی اور قدردانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن فرمائیے چارہ کیا ہے؟ پورے چار برس گزرے بجز اس کے کہ ہر کام میں میری مخالفت کی گئی اور کیا ہوا اس بنا پر میں ندوے کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں ایک برس بھی آزادی سے کوشش کر سکتا تو ندوے کو کچھ ترقی دے سکتا اس لیے بہتر ہے کہ اور لوگ یکسوئی سے کام کریں ممکن ہے کہ وہ مجھے اچھا کر سکیں بہرحال میں مدرسہ اور طلبا کا ویسا ہی خدمت گزار رہوں گا۔"

اب مولانا دسمبر کے دوسرے ہفتے میں لکھنؤ آئے طلبا نے خیر مقدم کا جلسہ کیا مولانا نے تقریر کی دسمبر کے آخر میں آخری سال کے لڑکوں نے مولانا سے درسِ بخاری کی خواہش کی اور بعدِ مغرب ہر روز یہ درس شروع ہو گیا مگر ناظم کے حکم سے مدرسِ اعلیٰ نے خارج اوقات میں طلبا کو کسی سے بھی درس لینے کی مخالفت کر دی، طلبا ہر سال کسی نہ کسی تاریخ میں بیانِ سیرت کی مجلس کرتے تھے اور مولانا تقریر کرتے تھے اس سال بھی اہتمام شروع ہوا اور مولانا کی تقریر کے خیال سے روکنے کی کوشش کی گئی لیکن پھر بعد کو عام بدنامی کے ڈر سے مجبوراً چند شرطوں اور قیدوں کے ساتھ اس کی منظوری دے دی گئی اس کے بعد اور واقعات پیش آئے جو طلبا میں ہیجان کا باعث بنتے گئے جن میں سے ایک طلبا کو سیاسی جلسوں میں شرکت سے حکماً باز رکھنا بھی تھا آخر ۷، مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا کی ہر قسم کی فہمایش کے باوجود طلبا نے اسٹرائک کا عام اعلان کر دیا۔

جماعت احرار نے جن کے (بقول مصنف) شیخ طریقت مولانا شبلی تھے اور اُن کے اخبارات نے طلبا کی حمایت کی قدامت پسند گروہ جن میں اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نواب حاجی اسحاق خاں اور دوسرے حکام رس اشخاص تھے ندوہ

کے کارکنوں کی حمایت میں تھا مدارس کی عام ڈسپلن اور کارکنانِ مدارس کی ہم دردی
کے نام سے علی گڑھ کالج کے اربابِ اقتدار اور مدرسہ دیوبند کے علما بھی ندوہ کے
مدعیوں کے ساتھ تھے اور یہ تصادم ملک کے طول وعرض میں پورے ڈھائی مہینے قائم
رہا، اسٹرائک کے اعلان کے ساتھ مولوی مسعود علی ندوی اور بعض طلبائے قدیم نے
اسٹرائک کی رہنمائی کی، رہنے سہنے اور تعلیم کا بھی انتظام کیا، اخبارات و رسائل اور
پمفلٹوں کے ذریعے رائے عامہ کو ابھارا، مولانا نے استعفا دینے کے ساتھ اپنے
ہم درد احباب اور شاگردوں کو اصلاحِ ندوہ کی طرف متوجہ کیا تھا ان ہی میں سے
بعض خطوط کو ڈاک سے اڑا کر دفترِ نظامت نے ۲۶-۲۷-۲۸ مارچ ۱۹۱۴ء کے
جلسہ انتظامیہ میں پیش کیا اور اخبارات میں شائع کرایا اور ثابت کرنا چاہا کہ اسٹرائک
اُن کی سازش سے ہوئی ہے مولانا نے اصلاح کی تحریک کا علی الاعلان اعتراف کیا،
اپریل ۱۹۱۴ء بہ مقام لکھنؤ مجلس اصلاحِ ندوہ قائم ہوئی اور تمام ملک میں اس کی شاخیں
قائم ہوئیں، ہندستان کے مختلف صوبوں اور شہروں بلکہ قصبات و دیہات میں تقریباً
پچاس جلسے مطالبۂ اصلاح کی تائید میں مسلسل منعقد ہوئے (خلاصہ ۶۴۸ تا ۶۵۵)

ان واقعات کے بیان کے بعد لکھتے ہیں کہ "اور حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی
سے ملک میں ندوہ کے انقلاب اور اصلاح کا صور جس نے پھونکا وہ مولانا ابوالکلام کا
آتش ریز قلم تھا انھوں نے الہلال میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی
بربادی پر اس زور وشور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ سی
لگ گئی اور ہر طرف ندوہ ندوہ کا شور برپا ہو گیا۔" (۶۵۶)

مصنف حیاتِ شبلی نے اصلاحِ تحریک کے اعتراف کے ضمن میں صفحہ ۶۵۵ پر
حاشیے میں صرف مولانا شبلی کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے کہ "اسٹرائک کا سبب کون
تھا" جو اسی زمانے میں اخبار ہم درد میں اور بعدہٗ مقالاتِ شبلی جلد ہشتم میں شائع ہوا؛

دوسرا حوالہ مولوی عبدالسلام کے ایک خط کا مع جزوی اقتباس ہے جو انھوں نے
۲۵ جولائی کو مولانا کے استعفے کے بعد اپنے ہم سبق دوست مولوی مسعود علی کو لکھا تھا
کہ اب خاموشی کا وقت نہیں مختلف مقالات میں جہاں جہاں آپ کا اثر ہو اظہار افسوس
اور ندوہ کے موجودہ نظام سے بے اطمینانی کے جلسے کرائیے سرکشی اور اسٹرائک کا وقت اب آیا ہے
اس خط کی خبر کسی کو نہ ہو مولانا کا حکم ہے۔" یہ خط بھی دفتر نظامت نے ڈاک سے اڑا لیا
مولانا نے اس خط کے متعلق بہ حلف اپنے مضمون میں لکھا کہ " نہ یہ خط میرے ایما سے
لکھا گیا ہے نہ میں نے اس کو دیکھا ہے اور نہ میں اب بھی اس کو جائز سمجھتا ہوں۔" مولوی
عبدالسلام نے اس خط کو اپنا قبول کیا مگر یہ لکھا کہ " میں نے مولانا کے استعفے کی منظوری
کی خبر سے مضطرب ہو کر لکھا اور مولانا کی طرف اس لیے نسبت کی کہ طلبا میں اس
تحریک کی اہمیت بڑھ جائے۔"
مصنف نے اس پورے تذکرے میں یہ بیان نہیں کیا کہ طلبا نے جلسۂ خیر مقدم
میں ایسی نظمیں پڑھیں اور تقریریں کیں جن میں موجودہ نظامت پر حملہ تھا لیکن مولانا
نے ان طلبا کو اس مذموم حرکت پر منع نہیں کیا۔
مجلس بیان سیرت میں یہ قیود لگائی گئی تھیں کہ بجز مولانا کے کوئی تقریر نہ کرے
اور اگر کوئی طالب علم نظم پڑھنا چاہے تو پہلے مدرس اعلیٰ کو دکھا لے۔ یہ واقعہ خود
مدرس اعلیٰ مفتی عبداللہ ٹونکی نے اپنی رپورٹ میں درج کیا ہے مگر مصنف ان قیود کو بیان
نہیں کرتے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ ناظم کے قبضے میں ایک خط تو مولوی عبدالسلام کا تھا
اور دوسرا خط خود مولانا شبلی کا مولوی مسعود علی کے نام مورخہ ۱۶ر اکتوبر تھا جس سے
مولانا نے انکار نہیں کیا۔ اول الذکر خط کی نسبت اس یقین کی کافی وجہ تھی کہ مولانا
کے حکم سے اسٹرائک اور ایجی ٹیشن کی تحریک ہے کیوں کہ وہ بمبئی سے آیا تھا اور کاتب خط
مولانا کے پاس دفتر سیرت میں کام کر رہے تھے مولانا نے اپنے خط میں اصلاح کے

تاہم یہ باقاعدہ ایجی ٹیشن جلسوں اور مظاہروں کی رہنمائی ایسے طالب علم کو کی تھی جن میں
تنظیمی کاموں کی فطری صلاحیت تھی اور جن کا نواح لکھنؤ میں کافی اثر تھا اس لیے طلبا
کو ان کے دست بدست روکنا ضروری تھا مگر مصنف نے ان واقعات کو مخفی رکھ کر دوسروں پر
بیچاری روکنے کا الزام قائم کر دیا۔

طلبا کے ہیجان اور اسٹرائک کے بیان میں یہ نہیں دکھایا کہ اصل وجہ ایک طالب علم
کا اخراج تھا جس کو درجۂ تعلیم میں ۱۲ر فروری ۱۹۱۳ء کو اساتذہ اور مدرس اعلیٰ سے
بدتمیزی وگستاخی اور تمرد کی وجہ سے یہ سزا دی گئی تھی۔ سیاسی جلسوں میں طلبا کی شرکت
اس زمانے میں تو کہیں بھی جائز نہ تھی اور اگر یہ وجہ ہوتی تو حکم ممانعت کے بعد ہی
اسٹرائک ہو جاتی یا طلبا اس پر احتجاج کرتے۔

مصنف نے اس امر پر بھی روشنی نہیں ڈالی کہ جب مولانا نے مدرس اعلیٰ وغیرہ
کو لکھ دیا تھا کہ اچھا ہو اگر اور لوگ یکسوئی سے کام کریں تو استعفے کی منظوری کے بعد
ایک مہینے کے اندر ہی جدید نظام کے خلاف ایجی ٹیشن اور اخبارات میں مضمون نگاری
کی ہدایات (جو خود مصنف کو بھی بہت زیادہ دی گئیں۔ اور وہ خطوط مندرجہ مکاتیب شبلی
میں موجود ہیں) کون سا جذبہ رکھتا تھا، نہ اس امر کو واضح کیا کہ مولوی عبدالسلام کے خط
کی اشاعت کے بعد عرصے تک مولانا کیوں خاموش رہے، ۱۶ر اکتوبر کو مولوی مسعود علی
کو جو ہدایات بہ طور ایک اسکیم کے دی گئیں ان میں مضمرات قلبی کیا تھے۔

مصنف نے ابوالکلام آزاد کے آتش ریزیٔ قلم اور نفخ صور کی جی کھول کر داد دی
ہی لیکن اپنے مسلسل مضامین کا ذکر نہیں کیا جو اخبار وکیل وغیرہ میں شائع ہوتے رہے،
مولانا آزاد کی نسبت مصنف نے ج۱ صفحات ۴۴۴ و ۵۴۴ میں لکھا ہی کہ وہ مولانا
کے تربیت و صحبت یافتہ تھے اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمرہی
جس صحبت کا فیض تھا وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہی۔ خود مولانا نے بھی اپنے

خط میں ان کو اپنا "عالم اسرار" لکھا ہے مگر ان کے آتش ریز قلم کی آتش فشانی کا بیانِ شبلی میں کوئی نمونہ نہیں دیا یہاں چند نمونے پیش کرنے کے قابل ہیں :

(۱) "جس جماعت کی شریعت پرستی اور تدین اور تقدس کے اعمال کا یہ حال ہو آج اُسے یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ اسٹرائک شرع ہے ۔ ندوہ ۔۔۔۔ وہ ندوہ جو سر سے لے کر پیر تک اُس کا وجود شریعت کی توہین اور تقدس کے احکام الٰہیہ کی تذلیل ہو طلبا کی اسٹرائک کو خلافِ شرع قرار دینے کا اپنے تئیں اہل سمجھتا ہے " ۸ اپریل ۱۹۱۴ء

(۲) مجلس کے وجود پر اعتراض کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ " وہ قطعاً عجیب الخواص ہے کیوں کہ جہل و فساد دونوں کا مجموعہ ہے ایک طرف تو اس کو دیکھ کر ان احمقوں کی بے وقوفی پر ہنسی آتی ہے جو ایک عظیم الشان مجلس کو چلانے اور قائم رکھنے کے وہم میں گرفتار تھے مگر انھیں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ دنیا بھر میں جلسوں اور جماعتی کاموں کے اصول کیا ہیں دوسری طرف ان کے اس فساد و شرِ عظیم پر متاسف ہونا پڑتا ہے کہ کس طرح قوم کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ندوے کے جسم سے یکسر روحِ حیات و عمل کھینچ لی اور پھر اس کی بے جان لاش پر گدھوں کی طرح گر کر پنجے مارنے لگے ۔ ۲۵ مارچ ۱۹۱۴ء

(۳) خاص ناظم صاحب کے متعلق جن کے اخلاص و حسنِ نیت کا معترف دیا ہے کو اعتراف ہے ارشاد ہوتا ہے "کذب بیانی باطل اندیشی مکر و حیل فریب و دسائس کا ایک پورا مجموعہ وہ رپورٹ ہے جو ۲۶ مارچ ۱۹۱۴ء کے جلسہ انتظامیہ کے وضعی ناظم ندوہ نے شائع کی ہے (۲۲ اپریل ۱۹۱۴ء)

ناظم کو شیخ الجہلا کا خطاب دے کر فرماتے ہیں کہ "چناں چہ حضرت کے لیے غبن اور اتلافِ مال کا پہلا کمزور امر ہے جب تک نظامت پر قبضہ نہیں ہوا تھا اور

وقت تک صرف اسی کا رونا تھا کہ ندوے کو کچھ نہیں ملتا لیکن ناظم ہونے کے بعد بڑی مصیبت یہ آگئی کہ جو کچھ بچی بچائی ہوئی پونجی غریب کے پاس رہ گئی تھی وہ بھی اب اس لکھ پتی ناظم کی راہ فتح یابی میں قربان ہو رہی ہے' (۸ راپریل ۱۹۱۴ء)
خلاف قاعدہ مجالس و مجامع خلاف اصول نظم عمومی خلاف قانون ندوہ بہ غیر ہیچ گونہ مناسبت و اہلیت ایک شخص ناظم بن بیٹھا دوسرے کو مددگار بنا لیا امیدوں کو بشارت اور آرزوؤں کو پیغام فتح یاب ملا جس کی ایک نظر مہر کی آرزو میں سالہا سال بسر ہو گئے تھے اب بے غل و غش زاہد ان کہن سال سے ہم کنار و ہم آغوش تھا۔
سے دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم - از بخت شکر دارم و از روزگار ہم..... حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ کے افساد سے زیادہ اس کی نادانی قابل گریہ ہے، وہ جو کچھ کر رہا ہے اس سے اس کا پہلا مقصود اپنی غرض پرستی اور دوسرا مقصود ندوہ سے اصلاح تجدیدیہ کے عنصر کو خارج کرنا ہے وہ شہرت کے لیے بھوکا پیاسا ہے اور نام وری کی ہوس سے پاگل ہو گیا ہے جہل و نادانی نے اس کے نفس پر یہ القائے باطل کر دیا ہے کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لیے نہ تو علم و فضل کی ضرورت ہے نہ تزکیہ و تنزیہ افکار کی نہ خدمت کا سچا ولولہ ہے نہ ایثار نفس کا کوئی نمونہ (۱۱ر مارچ ۱۹۱۴ء)

یہ چند اقتباس مشتے نمونہ از خروارے ہیں اور قلم آتش ریز سے یہ انگارے مولوی خلیل الرحمان پر ہی نہیں (جن کے حسن نیت اور اخلاص کے مصنف معترف بھی ہیں) بلکہ دیگر ارکان پر بھی مثلاً حکیم سید عبدالحیٔ اور مصنف کے الفاظ میں بزرگ و ثقہ مخدوم مولانا شیروانی مولانا احمد علی صاحب محدث میرٹھی وغیرہ پر بھی ہیں جن کے ارکان) کے ہر کارروائی کی روداد پر جو ناظم نے بہ طور رپوٹ شائع کی دستخط ثبت ہیں۔

مصنف نے اسٹرائک کے متعلق مولانا کا دامن صاف بچا دیا ہے اور ان

کے ایک مضمون کا حوالہ دے دیا ہے، حالاں کہ اس سلسلے میں اس کا اقتباس نہایت اہم تھا۔ اس مضمون کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے "حقوق طلبی کی جو عام ہوا چل رہی ہے اسٹرائک کے جو عظیم الشان واقعات علی گڑھ آگرہ لکھنؤ میں پیش آچکے ہیں حریت اور آزادی کا مذاق جو عام ہو رہا ہے (صحیح ہو یا غلط) لیکن کیا اس سے کسی درس گاہ کے طلبا بے اثر رہ سکتے ہیں آپ جس کو اسٹرائک کہتے ہیں وہی چیز دوسروں کی نظر میں حقوق طلبی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے تاریخوں میں پڑھ کر کہ فاروق اعظم کو عین ممبر پر ایک عامی شخص نے یہ جواب دیا تھا کہ" اگر تم ٹیڑھے چلو گے تو تلوار سے تمھارے بل نکال دوں گا "کسی کو یہ خیال تک نہیں آیا کہ یہ اسٹرائک یا بغاوت تھی یہ آزادانہ فقرے تاریخ اسلام کے طغرائے امتیاز ہیں ان حالات کے ساتھ بخاری شریف کے درس اور مولود شریف کے روکنے پر اسٹرائک کر دینا کون سی تعجب کی بات ہو سکتی تھی۔

لیکن کیا اس طرح مولانا کا دامن پاک رہ سکتا ہے ان کو اسٹرائک کے ارادے کی اطلاع تو یقینی تھی کیوں کہ انھوں نے اقرار کیا ہے کہ" اپنی نسبت سوءظن ہونے کے اندیشے سے بعض طلبا کو اسٹرائک سے روکا" پھر انھوں نے اس کی حمایت کی اور جب اسٹرائک کے خلاف مضامین شائع ہوئے تو انھوں نے اس مضمون میں اس کے جواز کا فتوا دیا، اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا کے محبوب و صحبت یافتہ دوستنے جو انگارے ان بزرگوں پر برسائے مولانا اسی طرح خوش ہوئے جس طرح بچہ آتش بازی سے خوش ہو سکتا ہے، مصنف نے بھی کچھ کم داد نہیں دی۔

مسلم یونی ورسٹی (تحریک)

کے عنوان میں لکھتے ہیں کہ "مولانا شبلی مرحوم کالج کے تعلق سے اس تحریک کی اندرونی تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ خواب کبھی ممنون تعبیر نہ ہوگا چنانچہ جنوری ۱۹۱۰ء میں مولانا شیروانی کو لکھتے ہیں کہ "ندوے میں چند لڑکوں کو انگریزی پڑھنے کی اجازت دینا اتنی ذراسی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے جس قدر نواب محسن الملک کی فرضی یونی ورسٹی، لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ دس بارہ برس کے بعد یہ فرضی یونی ورسٹی جن لوگوں کے ہاتھوں واقعی بن جائے گی ان میں خود مولانا کا ہاتھ بھی شامل ہوگا واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں طرابلس و بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش تھا اور انگریزوں کی طرف سے دلوں میں بے حد ناراضی پھیلی تھی اور ان کی ذرا ذراسی بات سے مسلمانوں کو چڑھ ہوتی تھی حکام کے سامنے ان ناخوش گوار حالات کا تدارک ازبس ضروری تھا اس کے لیے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالم گیر اسلامی تحریک شروع کر دی جائے جو مسلمانوں کے رخ کو ادھر سے ادھر پھیر دے، یہ چیز ایک مسلم یونی ورسٹی کا تخیل تھا، جس کو لے کر ہز ہائی نس سر آغا خان جو اس وقت کے مسلّم قومی رہ نما اور انگریزوں کے معتمد تھے آگے بڑھے، علی گڑھ پارٹی کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی رہ نمائی کی باگ نکل رہی تھی اس کو دوبارہ ہاتھ میں لینے کے لیے بھی یہ تدبیر کارگر ہو سکتی تھی بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔" (۵۳۰ و ۵۳۱) اس کے بعد چندے کی وصولی کا ذکر کر کے الندوہ (جنوری ۱۹۱۱ء) کا ایک شذرہ منقول ہے جس میں ہز ہائی نس آغا خان کی مدح و ستایش بھی ہے بعدہٗ مولانا شبلی کی کوششوں کو بیان کیا ہے، نیز ان کی ایک نظم نقل کی ہے جو لاہور کے جلسۂ عام میں انھوں نے پڑھی تھی جب کہ ہز ہائی نس چندہ کے لیے ایک ڈپوٹیشن لے کر پنجاب گئے تھے اور

مولانا بھی ایک رکن کی حیثیت سے معیت میں تھے،

اب دیکھیے کہ ان چند سطروں میں کتنی تدلیس اور واقعہ آفرینی ہے، مسلم یونی ورسٹی کا تخیل تو ۱۸۹۸ء سے موجود تھا، سرسید کی رحلت کے بعد عملی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ہز ہائی نس آغا خان ۱۹۰۲ء سے اس تحریک کے زبردست حامی تھے اور کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس میں اس تحریک کے خدوخال کو نمایاں کرکے اور یونی ورسٹی کی اہمیت جتا کر سرمایہ کے لیے اپیل کی تھی۔ ادھر کالج کی توسیع اسی مطمح نظر سے ہوتی رہی ۱۹۰۸ء میں ٹیکنیکل ایجوکیشن وغیرہ کی اسکیمیں کالج میں زیر غور تھیں جنوری ۱۹۱۱ء[۱] میں ہز ہائی نس پھر علی گڑھ آئے اور انھوں نے ایڈرس کے جواب میں جو تقریر کی اس میں یونی ورسٹی کے خواب کی عملی تعبیر پر زور دیا اسی دوران میں ملک معظم کی تاج پوشی کے دربار دہلی کا غلغلہ بلند ہوا، مولانا محمد علی اور دیگر اصحاب نے تحریک کی کہ اس تقریب کی یادگار میں ایک مستقل سائنس کالج بنایا جائے، آنریری سکریٹری نواب وقار الملک نے ان تجاویز کے متعلق ہز ہائی نس کو ایک خط بھیجا جو اس وقت فرانس میں تھے ہز ہائی نس نے جواب میں لکھا کہ "میں غور کامل کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک مرکزی تحریک کا آغاز کیا جائے جس کے دائرے میں دیگر تمام تحریکیں آجائیں اور یہ موجودہ ملک معظم کی تشریف آوری کا نیز آئندہ سال رونق افروزی ہند اور تاج پوشی کی یادگار رہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے تین مختلف فنڈ کے لیے چندہ طلب کیا یعنی ایک لارڈ منٹو کی یادگار کے لیے اور ایک بادشاہ کی تخت نشینی کی یادگار کے لیے اور کچھ یونی ورسٹی کے لیے تو ہماری کوششیں منقسم ہو کر شاید کچھ نہ رہیں۔

---

[۱] اسی سفر میں ہز ہائی نس نے لکھنؤ ندوے کا معائنہ کیا اور پانسو روپے [illegible] گرانٹ منظور کی۔

ہز ہائی نس نے فوراً ایک اسکیم اور کمیٹی بنا کر عملی کام کا بھی مشورہ دیا اور پھر ہندستان پہنچ کر کانفرنس منعقدہ ناگ پور ۱۹۱۰ء میں عملی کام پر متوجہ کیا اور اپنے عطیہ کا اعلان کر دیا، جنوری ۱۹۱۱ء سے منظم طور پر کام شروع ہو گیا بعض مقامات کے دوروں میں خود ہز ہائی نس شریک رہے، علی گڑھ پارٹی سے مراد ہمیشہ سکریٹری اور اس کے رفقا رہی ہے کالج کے سکریٹری اس زمانے میں نواب وقار الملک تھے اور مسلم ہے کہ اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں وہ اپنی قوم پر بہت زیادہ اثر رکھتے تھے قدیم و جدید تعلیم کے دونوں گروہ اور عامۃ المسلمین اُن کے حلقۂ قیادت میں تھے اگرچہ ایک دو سال پہلے وہ مسلم لیگ کی سکریٹری شپ سے مستعفی ہو گئے تھے اور اس کا مستقر بھی علی گڑھ سے لکھنؤ ہو گیا تھا لیکن اس ادارے پر بھی ان کا اقتدار تھا، اسی پارٹی لیڈر کی موت پر مصنف حیاتِ شبلی نے "قوم کا ماتم" کیا تھا، اس لیے کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ پارٹی کے ہاتھوں سے رہنمائی کی باگ نکل رہی تھی۔
طرابلس کا ہنگامہ تو آخر ستمبر ۱۹۱۱ء سے شروع ہوا۔ حکومت برطانیہ غیر جانب دار تھی مارچ ۱۹۱۲ء میں سلطان المعظم نے ملک معظم برطانیہ کو تمغے اور قلم خاص کا لکھا ہوا نامۂ مودت بھیجا ۱۲ر مارچ کو ترکی مشن کے ارکان نے باریاب ہو کر یہ تحائف پیش کیے۔

مظلومانِ طرابلس کی مالی امداد میں حکومت ہند نے ہر قسم کی سہولتیں دیں، ان واقعاتِ صحیحہ کے ساتھ مصنف حیاتِ شبلی کے آفریدہ واقعات پر پھر ایک نظر ڈالی جائے۔ اب اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو لاہور میں مولانا نے پڑھی تھی۔

کنوں دہ سال شد کیں خوابِ نوشیں در نظر داریم — کہ خواب ایں چنیں خود جانفزا و جانفزا باشد
نے پیدا نہ شد ایں خواب را چوں صبح تعبیرے — گماں بردیم کیں اندیشہ از روئے خطا باشد
دریں بودیم ما کز پردہ گاہ غیب سر بر زد — ہمایوں طلعتے کہ عقدہ را مشکل کشا باشد

بکلیش شیعی و سُنّی سر آغا خاں خداؤند
ولیکن کشتی اسلامیاں را ناخدا باشد
کنوں بینی کہ روزے آں گلشن رنگیں بپا گردد
کہ شبلی ہم درو یک بلبل رنگیں نوا باشد

مولانا کی کوششوں کے سلسلے میں تحریر ہے "کہ مجلس تاسیس جامعۂ اسلامیہ (مسلم فونڈیشن کمیٹی) کے نام سے قواعد وضوابط بنانے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی مولانا اس کے بھی ممبر تھے:" افسوس ہے کہ مصنّف نے فونڈیشن کمیٹی اور کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں امتیاز نہیں کیا تاسیسی اور دستوری کمیٹیوں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے پہلی کمیٹی میں بہت سے ممبر تھے (ڈیڑھ دو سو ہوں گے) اور دوسری میں چند ماہرین تعلیم، جن میں مولانا کا کہیں نام نظر نہیں آتا، مولانا شبلی کا ہاتھ اس" فرضی یونی ورسٹی) کے بنانے میں عام مسلمانوں کے ہاتھوں سے ممیز نہیں پھر اول مرحلے پر تو وہ نظم نظر آتی ہے جو لاہور میں پڑھی اور اس کے بعد تو طنزیہ نظمیں ہی دکھائی دیتی ہیں کیا لاہور والی نظم محض ہز ہائی نس کو خوش کرنے کے لیے لکھی گئی اور ندوہ کی مالی واخلاقی امداد کی وجہ سے انگریزوں کے اس معتمد کو مسلمانوں کی کشتی کا ناخدا بنا دیا گیا، کیا یہ ضمیر فروشی کی بدترین مثال نہیں؟

بمبئی اور دستۂ گل کا پس منظر

مولانا شبلی کی زندگی میں جس طرح یہ نازک ترین واقعہ ہے اسی طرح مصنّف حیات شبلی نے کمال نکتہ آفرینی کے ساتھ اوراقِ حیات کے پردہ پر پیش کیا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ع

"مستند ہے میرا فرمایا ہوا" تدلیس کی انتہا کر دی ہے، لکھتے ہیں

میری یاد میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفر بمبئی پہلا اور یہی دستۂ گل کی عطر بیزی اور مشام پروری کا زمانہ تھا، دستۂ گل کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار کے پھول "نثار بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را۔ مولانا کو ۱۹ برس کے بعد غزل کا کوچہ یاد آیا، ۱۱ ستمبر ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے مہدی افادی مرحوم کو لکھتے ہیں" ابریسا

بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا یہاں کی دل چسپاں غضب کی محرک ہیں آدمی ضبط نہیں کرسکتا اپالو یہاں ایک عجیب سیرگاہ ہو اور چوپاٹی اس کا جواب ہو خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہو "کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را" اس غزل کا شعر ہو سے بہر سو ازہجومِ دلبرانِ شوخ بے پروا ، گذشتن از سرِ رہ مشکل افتادست رہرو را (مہدی ۲۶) یہ غزلیں اتنی مست تھیں کہ مولانا حالی نے ان کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا اور قیاس فرمایا کہ اس میں چشم ساقی کی مستی بھی آمیز ہو خود شاعر نے بھی اپنے اعترافات کا مغالطہ آمیز موقع رکھا ہو سے

اندکے نیز بہ کامِ دلِ خود ہیں باشم	روزگارے چو دم دانش و عرفاں زدہ ام
چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگو	سنگ بر شیشۂ تقوی زدہ ام ہاں زدہ ام
جامہ زہد چو بر قامتِ من راست نبود	شیشۂ تقوی سی سالہ بہ سنداں زدہ ام
آں شدلے دوست کہ آراستے پیکرِ فن	نقشِ زیباصنمے بر ورقِ جاں زدہ ام
آں شدلے دوست کہ در ندوہ ببینی ہاں	کہ دم از صحبتِ آں دشمنِ ایماں زدہ ام

وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہوتی ہو وہ غلطی سے اس دشمنِ ایمان کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں حالاں کہ وہ علی گڑھ میں تھا" یعنی کہ وہ علی گڑھ تحریک سے الگ ہوکر ندوہ میں شامل ہوگئے " یہ غزلیں رسالوں میں چھپیں اور زبان وطرزادا کی بڑی تعریفیں ہوئیں معاصر شعرا نے جوابی غزلیں لکھیں جو خوش گمان تھے وہ ان کو تصوف کے رموز واسرار سمجھے اور مولانا سے دست بیعت ہونے اور ان کے پیر کی تلاشیں ہونے لگیں جو بدگمان تھے وہ اس وصفِ عنوانی کے افراد کی تلاش میں لگ گئے حالاں کہ واقعہ نہ یہ تھا نہ وہ ، بلکہ صرف بمبئی کی خوش سوادی اور حسنِ منظر نے اُن کے شاعرانہ جذبات کو اُبھار دیا تھا" خطوط شبلی کے اوراق میں یہ سامان نہیں ان کی تاریخ دو برس کے بعد ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتی ہو (۱۵۴ و ۱۵۷)

اب حقائق پر نظر ڈالیے، مولانا شبلی کو سیر و تماشہ اور رنگین صحبتوں دلچسپی تھی وارفتہ مزاج اور حسن پسند تھے جذبہ و عقل کی کش مکش میں جذبہ غالب ہوجاتا تھا پہلی بیوی کے انتقال (۱۸۹۶ء) کے بعد ۱۹۰۰ء میں تاہل اختیار کیا تو نئی بیوی کی تعلیم کے متعلق ہدایت کرتے ہوئے اپنے ایک عزیز دوست کو لکھتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ حسن صورت کی نوبت ہوچکی میری قسمت میں دونوں کا اجتماع نہ تھا اب کوئی چیز مایۂ تسکین ہو سکتی ہے تو صرف حسن سیرت ہے اس کے لیے سب سے مقدم تعلیم ہے۔ (سمیع ۱۸۹ مکاتیب) ۱۹۰۵ء میں جب مولانا حیدرآباد سے ندوے میں آگئے تھے اور جائزۂ خدمات لے چکے تھے ان بیوی کا بھی انتقال ہوگیا یہ سخت صدمہ تھا جیسا کہ خود کہا کہ "اس زور سے چیخ کر رویا کہ خود مجھے اپنی جان کا خوف پیدا ہوگیا (۴۷۰ حیات) مارچ ۱۹۰۶ء میں بنارس میں ندوہ کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا اس کے اہتمام کی مصروفیت نے غم غلط کیا اس سے فارغ ہوئے تو قلب حزیں کی تسکین کے لیے وہیں (معبد رام میں) رہ گئے لیکن یہاں اسباب تسکین نہ تھے لکھنؤ آئے اور قرآن مجید کے درس دینے میں بھی جی نہ لگا اور اگست میں بمبئی چلے گئے مصنف حیات شبلی اس کی توجیہہ کرتے ہیں کہ "مولانا گرمی اور لو تو برداشت کر لیتے مگر برسات کا حبس اور پسینہ برداشت نہیں کرسکتے تھے اس لیے اس زمانے میں بمبئی میں سمندر کی آب و ہوا اُن کو پسند تھی" (۵۱۳ حیات) مگر مولانا کی زندگی میں اس سے پہلے بمبئی یا کسی پہاڑ اور ساحل سمندر پر اس زمانے میں رہنے کا پتا نہیں، بلاشبہ مولانا دوچار دفعہ بمبئی جا چکے تھے وہاں کی فضا اور دلچسپیوں سے حظ اُٹھانے کا بھی اندازہ کرچکے تھے، اس موقع پر بمبئی ہی غم غلط کرنے اور حظ

۵۱؎ قاہرہ میں تھیٹر دیکھنے کے متعلق مولانا اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں ؎

گاہ در قاہرہ پنہاں بہ تقاضائے ہوس ... بہ تھیٹر مشدہ و در جلوہ گہ ناز آمد

اٹھانے کے لیے موزوں ترین مقام تھا یہاں چوپاٹی اور اپالو کی سیر کے ساتھ ایک سرور انگیز صحبت بھی تھی جو ایک معزز خاندان "طیب جی" میں حاصل ہوئی۔

مسٹر جسٹس بدرالدین طیب جی کے عموزاد بھائی حسن آفندی ایک نہایت خلیق اور مہماں نواز بزرگ تھے ان کا تجارتی کاروبار قسطنطنیہ میں بھی تھا اور جب مولانا وہاں گئے تھے تو حسن آفندی نے بڑی خاطر مدارات کی تھی جس کا ذکر مولانا نے اپنے سفرنامے میں بھی کیا ہے وہ اس زمانے میں مع خاندان بمبئی میں تھے ان کی بیگم صاحبہ امیرالنسا "ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور مولانا سے پہلے سے واقف تھیں ان کی تین صاجزادیاں بھی تھیں (۱) زہرہ بیگم (۲) نازلی رفیعہ بیگم (۳) عطیہ بیگم۔ زہرہ بیگم بیوہ تھیں ان میں کمال متانت تھی تصنیف و تالیف کتب یعنی مضمون نگاری مشغلہ تھا نازلی بیگم کی شادی ہز ہائی نس نواب بہادر جنجیرہ سے ہوئی تھی اور بمبئی آتی جاتی رہتی تھیں عطیہ بیگم نوجوان دوشیزہ یورپ میں بھی کچھ دن بہ غرض تعلیم رہ چکی تھیں اور شوخ وطرار تھیں یہ سب بہنیں قومی معاملات سے بھی دلچسپی رکھتی تھیں اور عورتوں میں اشاعت تعلیم کی منادی تھیں زہرہ بیگم اور عطیہ بیگم نے علی گڑھ کے زنانے مدرسے کے متعلق بھی بہت کام کیا تھا، یہ خاندان تھا جس میں مولانا کا بڑے تپاک و احترام سے خیر مقدم ہوا اگرچہ یہاں علمی و قومی مذاکرات رہتے لیکن عطیہ بیگم کے ساتھ مولانا کو شیفتگی ہوگئی اور ان کے جذبات میں تلاطم رہنے لگا مصنّف کہتے ہیں کہ بمبئی کی خوش سوادی اور حسین مناظر سے شاعرانہ جذبات اُبھرے بلاشبہ اس طرح بھی اُبھرتے ہیں لیکن مولانا کے جذبات بمبئی مناظراور خوش سوادی میں حسن انسانی نے ابھارے تھے کیوں کہ اُن کے کلام دستۂ گل میں زیادہ تر ایسے ہی جذبات پائے جاتے ہیں جو کسی انسان دشمن ایمان کا پتہ دیتے ہیں اور وصف نسوانی کے افراد کا نشان بتاتے ہیں۔

مولانا حالی نے چشم ساقی کی مستی کی آمیزش تیا سانہیں بتائی بلکہ پولیسے جملے

ہیں حقیقت عُریاں کردی ہے۔

"کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اُس شخص کا کلام ہے جس نے سیرت النعمان الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں غزلیں کا ہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشے میں خمارِ چشمِ ساقی بھی ملا ہوا ہے، غزلیات حافظ کا جو حصّہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل رُبائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیب است سالک را
خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کون سی بات ہے مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا الا الذی ابتلےٰ بمثال ما ابتلےٰ بہ القائل۔"

مصنّف نے اعترافات کا مغالطہ آمیز موقع رکھنے کی شہادت میں ایک طویل غزل کے پانچ شعر نقل کیے ہیں اور آخری شعر کے دشمنِ ایمان کو "علی گڑھ تحریک" قرار دیتے ہیں یعنی کہ وہ (مولانا) علی گڑھ تحریک سے الگ ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے، اور اس کو بمبئی میں تلاش کرنے کی حرفی سخن فہمی اور غلطی کہتے ہیں، اور اس صفِ عنوانی کے افراد کی تلاش بدگمان لوگوں کا کام بتاتے ہیں۔

تعجب ہے کہ مصنّف حیاتِ شبلی نے دھوکے میں ڈالنے کی ایسی کھلی اور بے جا جسارت کی ہے، مولانا تو اسی وقت (۱۸۹۴ء) میں ندوہ میں شامل ہوئے جب کہ علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھے اور اگر کالج کی ملازمت سے الگ ہو کر آنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ مولانا حیدر آباد کی ملازمت چھوڑ کر آئے تھے علی گڑھ سے جُدا ہوئے تو آٹھ سال گزر چکے تھے علی گڑھ تحریک سے علی گڑھ کا مشن مقصد ہے تو مولانا اس سے کبھی الگ نہیں ہوئے جیسا کہ ان کے اوراقِ حیات سے ثابت ہے، بلاشبہ مولانا تلاطمِ جذبات میں

وہ سب کچھ کہہ گئے جو مکنونِ خاطر تھا اور واردات قلبی تھی ان اشعار کو سلسلے وار پڑھیے اور پوری غزل دیکھنے کے قابل ہے جس میں ایک شعر یہ بھی ہے ؎

بمبئی بود مرا منزلِ مقصود عبث　　پیش ازیں گام طلب در رہِ عرفاں زدہ ام

اس منزلِ مقصود پر پہنچ کر شاعر نے دانش و عرفان سے تھک کر دم لیا ہے اور اپنے دل کی مراد نکالنا چاہتا ہے اور یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کے جسم پر جامہ زہد موزوں نہیں لہٰذا وہ شیشۂ تقویٰ کو سنداں پر مار دیتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ لے دوست وہ زمانہ گیا جب کہ میں پیکرِ فن آراستہ کرتا تھا اب تو ورقِ جاں پر صنمِ زیبا کی تصویر بنا لی ہے، اور اب ہو چکا کہ تو مجھے دوبارہ (باز ہندوہ میں دیکھے گا کیوں کہ اس دشمنِ ایمان کی صحبت میں مصروف ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس دشمنِ ایمان کا مقام کہاں ہے اور وصفِ عنوانی کے فراد واہمہ ہیں یا حقیقت لیکن اس سے قبل خطوطِ شبلیؔ کی تاریخ بھی سُن لیجیے جس میں مصنف کو یہ سامان نظر نہیں آتے اور جن کی تاریخِ آغاز دو برس بعد ۱۹۰۸ء قرار دی گئی ہے۔

عامۃً لوگوں کے پاس سلسلے وار خطوط محفوظ نہیں ہوتے اور نہ ابتدائے مراسلت وقت پر جب تک کہ خاص اہتمام نہ ہو ان بیگمات (زہرہ بیگم و عطیہ بیگم) کے پاس بھی ابتدائی خطوط محفوظ نہ تھے لیکن ہم کو اس مجموعے کے پہلے خطوط سے ہی ۱۹۰۶ء سے قبل کے تعلقات صاف معلوم ہو جاتے ہیں۔

(۱) جنجیرہ کے سفر کا جو موقع جاتا رہا اس کا افسوس اس وقت تک رہے گا جب تک کہ پھر ایسا موقع ہاتھ نہ آئے، ہمت نہیں ہوتی ورنہ یورپ کے سفر کا اچھا موقع تھا........ ندوہ کے انگریزی کاغذات زہرہ بیگم صاحبہ کو دے آیا تھا کہ تم کو دے دیں...... اگر اس خط کا جواب آیا تو بہت سی ضروری باتیں تم کو لکھنی ہیں۔ (۲۷ر فروری ۱۹۰۸ء)

(۲) بے شبہ جنجیرہ نہ آسنے کا رنج ہے لیکن اب جنجیرہ کا آنا یقینی ہے اب نہ سہی پھر سہی یورپ کی ہم سفری بھی چنداں بعید نہیں ممکن ہے کہ ہمت پیدا ہو اور ساتھ چل سکوں۔
(۲۴ر فروری ۱۹۰۸ء)

اب دشمن ایمان اور اُس کے مقام کو وصفِ عنوانی کے افراد کی حقیقت کو خطوطِ شبلی اور مکاتیبِ شبلی[1] میں دیکھیے۔

خطوطِ شبلی بنام عطیہ بیگم (۱) اہلاً وسہلاً عزیزی ایک بے ریا دل ایک مخلص دل وفا شعار دل کی طرف سے سفر سے مراجعت[2] کی مبارک باد قبول کرو، میری زندگی کا یہ سخت افسوس ناک واقعہ ہے کہ یہ مبارک باد میرے لب کی بجائے زبانِ قلم ادا کرتی ہے۔ واقعات ایسے ہیں کہ ایک دن کے لیے یہاں سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔

تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے جس کے ساتھ ایک نہایت حقیر ہدیہ ہے کیا تم ان دونوں چیزوں کو قبول کر سکتی ہو شہنشاہ ایڈورڈ اور پریزیڈنٹ فرانس کا معزز مہمان اس قدر اپنے رتبے سے اُتر نہیں سکتا، ہاں یہ سچ ہے، لیکن یاد رکھو آفتاب ذرّے پر بھی چمکتا ہے میں خود نہ آسکا لیکن عنقریب اپنی تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے بھیجتا ہوں وہ میری قائم مقامی کرے گی آؤ، ایک مرتبہ پھر تم کو مبارک باد دے دوں، جناب نواب صاحب بہادر اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں مبارک باد اور تسلیم۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۰۶ء

(۲) ہر رگِ سنگم شرارے می نویسم   کفِ خاکم غبارے می نویسم

تمھارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگا لیا اور دیر تک

---

[1] افسوس ہے کہ راقم نے خطوطِ شبلی کو شائع کرتے ہوئے جب دیباچہ لکھا تو مکاتیبِ شبلی کے خطوط موسومہ مہدی افادی و موثق حیات حبیب الرحمان خاں شیروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) پیشِ نظر نہ تھے۔ [2] ملاحظہ ہو خط موسومہ مہدی اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ

بار بار پڑھتا رہا، افسوس دیر تک ملنے کی اُمید نہیں پیش وطن احباب آرام سب چھوڑ سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی اور قومی کام کیوں کر چھوڑ دوں ورنہ بمبئی یا جزیرہ دو قدم پر سمجھے۔ (۲۸ اپریل ۱۹۰۹ء)

(۳) اور عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری تعریف اور توصیف کا ایک شعر ہے تم کہتی ہو کہ میں "بدہمت" ہوں میری زندگی کے دو حصے ہیں پرائیوٹ اور پبلک اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کر سکتیں تم کو کیا معلوم ہے کہ مجھ کو کیا مشکلات ہیں تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے۔
(۱۹ اگست ۱۹۰۹ء)

(۴) شوق تو از کجا بہ کجامی برد مرا | نزدیک شد کہ گرد رہ کارواں شوم
یا بمبئی رسیدہ ام و زود تر بود | کز بمبئی بسوئے جزیرہ رواں شوم

(۳۰ نومبر ۱۹۰۹ء)

اِن خطوں کے بعد بے تکلف دوست مہدی اور نہایت ثقہ دوست موثق حیات کے نام جو خطوط ہیں ان کے چند اقتباسات بھی سلسلے وار ملاحظہ ہوں اور یہ وہ سامان ہے جس کو قابل مصنف حیات نے جمع کر کے پبلک کے سامنے پیش کیا ہے۔

مکاتیب بنام مہدی حسن افادی

(۱) ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء ۔ اب کے مخزن میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے دیکھیے گا، البتہ جا بہ جا غلط چھپی ہے "کافروں" کا ذکر اس میں بھی ہے۔

(۲) ۲۱ مارچ ۱۹۰۶ء ۔ بمبئی میں بڑی دل چسپیاں رہیں جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں ۱۶ صفحے ہو گئے تو چھپنے کو دے دیے اس میں کچھ پچھلے سال کا بھی حصہ ہے بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئیں جو شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے

پر نہ کھلیں لیکن حافظ تو کہتے ہیں ع ہر گہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم۔
اور ایک پیرانا تجربہ کار لکھتا ہے ع عشق در ہنگام پیری چوں بہ سرما آتش است
کیا یہ فلسفہ صحیح ہے۔

(۳) ۳ ؁ ۔ ۳ ر جولائی ۱۹۱۰؁ء۔ بمبئی کی زندہ دلی "میں سمجھتا ہوں کہ آپنے اس پر نوٹس لیا
ہوگا آج یقین ہوا کہ یورپ رہ گیا تھا، جس فتح کی آپنے بشارت دی ہے نئی نہیں،
ولایت ان فاتحوں کا جولاں گاہ رہ چکا ہے یورپ بوالہی تہذیب سال بھر میں
ایک دن پاگل ہوجاتا ہے بمبئی کے دن اسی دن کے سلسلے میں شامل ہیں۔

(۴) ؁ ۔ ۲۸ راگست ۱۹۱۰؁ء۔ شعر العجم کا دوسرا اور تیسرا حصہ بھی قریب الختم ہے ۲۲۶
صفحوں کی کاپیاں بھی مطبع سے آچکیں، اور لکھتا لیکن ایک جنس لطیف کا
خط سامنے ہے اور جواب لکھتا ہے اس فرعونیت کو دیکھیے کہ ان شاہنشاہوں
کو بھی ابتداءً نہیں لکھتا پھر آپ کو شکایت کا کیا موقع

(۵) ؁ ۔ اکتوبر ۱۹۱۰؁ء۔ حال میں خیر مقدم لکھا ۹ راکتوبر کو لوگ بمبئی آگئے لیکن
خیر مقدم میں جہاں جہاں اصلی رنگ اُبھرا تھا اُن پر سیاہی پھیر دی دو شعر آپ
بھی سُن لیجیے

شیشہ ہائے دل عشاق تپید ... کہ گزندش رسد از دست پا می آید
مژدہ آب بخاک براش کیں کار ... شیوہ ہست کہ از دیدۂ می آید

(۶) ؁ ۔ ۲۴ ر نومبر ۱۹۱۰؁ء۔ بمبئی کا مہمان آج کل حسن اتفاق سے یہیں ہے یہ لفظ یعنی
اس کا پہلا جز کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوگا لیکن بدقسمتی
دیکھیے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے
موقع سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، نہ وقت، نہ دماغ حسرت کا بھی اس سے
بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز

پہلو نظر سے گزر رہے ہیں اُردو، فارسی انگریزی فرنچ زبان دانی مصوّری نقشہ کشی پالٹکس قوت تحریر ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری ۔
افسوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی ورنہ آپ بھی وہ دیکھتے جو میں کہتا ہوں

(۷) ۲۳۵ ۱۱ر دسمبر ۱۹۰۸ء ۔ جمبئی) ندوہ کے بدمزہ اشغال نے دل اور آنکھوں کو اپنا کام کب کرنے دیا کچھ دیکھتا دکھاتا اب تک وہ خمار نہیں اترا سو سو طرح چاہتا ہوں کہ اس دام سے دو دن کے لیے بھی دور رہوں لیکن اور زیادہ اُلجھ جاتا ہوں، ٹرکی کی ارتقائی حالت کی نسبت سلطانِ جمال کی رائے بالکل عام دُنیا کے مخالف ہو یہاں بھی یکتائی کی شان ہو اُن کا خیال بلکہ تجربہ او رمشاہدہ ہو کہ ٹرکی ایک یورپین طاقت کا بازیچہ ہو اور یہ پتلیاں صرف بیرونی تاروں پر حرکت کرتی ہیں جدید فرنس نے اپنی جانستانی کا کام انجام دیا ہو اور دیتا جاتا ہو، لیکن باوجود اس "عبودیت" کے اس مسئلے میں میں اب تک صاحبِ ایمان نہیں، یہ ضرور نہیں کہ "سیاست" اور "حُسن" کا ایک ہی فرماں روا ہو

(۸) ۲۵۶ ۳ جون ۱۹۰۸ء ۔ مکرمی آپ میرے جن دوست کے پولیٹکل خیالات کے قدر داں ہیں اور جن کا حوالہ آپنے ٹرکی کے موجودہ انقلاب میں دیا تھا اس کے ایک خط (جو ابھی میرے پاس آیا ہو) کے یہ الفاظ ہیں "کانفرنس اور مسلم لیگ سخت ڈھکوسلے ہیں بزدل اور جاہل لوگوں کے انگریز جس قدر مسلمانوں کو بناتے ہیں اسی قدر یہ بنتے چلے جاتے ہیں اصل تحریر محفوظ ہی کبھی موقع ہو تو دیکھیے گا ۔

عبدالحمید جس نے ۳۵ برس تک یورپ کے پالٹکس کے اوراق کا تاش کھیلا ہو اس کی اور ینگ ٹرکی کی نسبت میرے دوست کی رائے صحیح ہو تو شاید کم وقعت فرقۂ جدیدۂ ہند کی نسبت بھی اس کی رائے قابل وقعت

ہو گی میں تو بہ خدا ان فقروں پر ایمان رکھتا ہوں گو "کافر" کے منہ سے نکلے ہیں۔

(۹) ۔۔۔ دکن کی "بجلی" پھر لکھنؤ پر گرنے والی ہے۔

(۱۰) ۔۔۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۰۹ء۔ آپ کے احرامِ جدید کی داد دوں یا رشک کروں ہاں بمبئی جاتا ہوں شرط یہ ہے کہ خود گاڑی تک آکر لوا جائیں کچھ ایسی بڑی بات نہیں کوئی کیوں رشک کرے۔

(۱۱) ۔۔۔ ۴ر نومبر ۱۹۰۹ء۔ ندوہ کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا اور اب چاہوں تو ایک آدھ مہینے باہر رہ سکتا ہوں الہ آباد بلائیے تو آجاؤں لیکن شرط یہ ہے کہ بمبئی کا نعم البدل نہ ہی، برابر سرابر تو ہو کیا اُمید ہو سکتی ہے۔

(۱۲) ۔۔۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۲ء۔ قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل و خوار بنا دیے گئے لیکن کیا ۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے بعد بھی جس دن کہ ۔۔۔۔۔۔[1] ایک یہودی کو ہاتھ آئی مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا اس لیے تو نہیں کہ ۶ میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا، خیر ؎ سبحہ را زنار کردہ ست و کند،

خطوط بنام حبیب الرحمان شیروانی

(۱) ۔۔۔ ۲۶ر فروری ۱۹۰۶ء۔ اب کے بمبئی میں عجب رنگین صحبتیں رہیں لیکن عالم لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نثار کر سکتا ہوں اور بے تکلف کر سکتا ہوں۔

---

[1] اگرچہ اصل میں نقاط ہیں لیکن یہ فقرہ عطیہ بیگم اور ان کے شوہر کی طرف (جو قبل شادی مسلمان ہو گئے تھے) صاف اشارہ ہے۔ مولانا کا یہ شعر بھی کہ ؎ بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو، عطیہ کی بدولت آج ایک کافر مسلماں ہے، اسی واقعہ کا مظہر ہے، شادی کے بعد یہ جوڑا یورپ کی سیر کو روانہ ہو گیا اور مولانا کا جوش بھی سرد پڑ گیا۔

(۲) ۱۹۰۶ء ۵ مارچ ترسا زادے بمبئی کے ایوان جمال کے جھوٹے طلسم ہیں سچی تصویریں الگ ہیں عراقی بھی ایرانی بھی اور خال خال ہندی بھی۔

مولانا کی طبیعت و مزاج کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اندازہ مندرجہ بالا اقتباسات سے ہو گیا ہوگا لیکن چند مزید اقتباسات اور بھی قابل ملاحظہ ہیں پہلا اقتباس ثقہ دوست مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام کے ایک خط کا ہے اور باقی مولوی ابوالکلام آزاد کے نام کے خطوط کے ہیں جو مولانا کے صحبت یافتہ اور عالم اسرار ہیں اور جن کی محبت کو ارکان ندوہ نے ایک الزام قرار دیا تھا۔[1]

(۱) بمبئی کے ایک آدھ شعر حاضر ہیں طرح جوشی را فراموشی را ہے

نیکرئی ہست کہ حسن کہ آں نرگس مست   بہم آمیختہ ہشیاری و مدہوشی را

من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال   بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی را

میں نے تو ایک خیالی بات لکھدی لکھنؤ کے ایک صاحب کے سامنے اخیر کا شعر پڑھا تو کہنے لگے کہ اس کالج کے پروفیسر یہیں مل سکتے ہیں ۲۲ نومبر ۱۹۰۶ء۔

(۲) انساں یہ درد دگر ہر زماں گرفتارم   کہ شیوہ ہائے ترا با ہم آشنائی نیست

بھائی تم نے دانستہ خط کتابت ترک کر دی ہو کہ الیاس احدی الراحتین لیکن تم رہ رہ کر ایک چرکا لگا دیتے ہو خیر جو مرضی یہ بھی منظور کلکتہ گیا ایک خاص کام تھا مولوی شرف الدین کے ہاں ٹھیرا دل جیبوں کی نئی راہیں نکلیں لیکن[2]

چہ خط خضر برد از عسر سبر باد داں تنہا   ۱۵ جون ۱۹۰۶ء

(۳) بے شبہ میری خواہش ہے کہ چند روز دنیا سے الگ بسر کروں ایسی حالت میں ایک تصنیف بھی انجام پائے لیکن متصل دن رات تو وحشت کدے میں بسر

---

[1] خط ۱۰ ۱۷ نومبر ۱۹۱۲ء مکاتیب شبلی

[2] بہ تخیل با تجب۔

نہیں ہو سکتی شیعوں کے علمی[۱] فلسفے کی کوئی صورت پیدا ہو تو البتہ ممکن ہے۔ ۵ دسمبر ۱۹۰۹ء

(۴) برج کی پڑتال ہو جائے تو لکھیے گا ہاں ایک روایت تھی کہ ماہ تمام بنگال کے افق پر نکلا تلاش سے شاید پتہ لگ جائے ۱۰ دسمبر ۱۹۰۹ء

(۵) برادرم اچھا کہیں نہیں جاؤں گا ع بندہ را فرماں نہ باشد ہرچہ فرمائی بر آنم لیکن کیا شبلی کو رابعہ کا درجہ مل سکتا ہے لیس الذکر کالانثیٰ، ماسٹر دین محمد وطن گئے تھے اور سخت جاں گزا خبر لائے یعنی بدر کامل حیدرآباد سے دلی پہنچ کر غروب ہو گیا مرتبہ ابراہیمی کہاں سے لاؤں کہ لا احب الآفلین کہہ کر دل ٹال[۲] ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۰ء۔

مصنف نے صفحہ ۱۳۰ پر لکھا ہے کہ "نواب صاحب جزیرہ (جنجیرہ) اور ان کا پورا خاندان مولانا کا شیدائی تھا چناں چہ جب بمبئی جاتے تھے تو اکثر ان لوگوں سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہتی تھیں، ایک بار اکتوبر ۱۹۱۲ء میں خود جزیرہ تشریف لے گئے تھے"۔ مگر یہ نواب صاحب جزیرہ کا خاندان نہیں تھا بلکہ حسن آفندی کا خاندان تھا۔ اور مولانا ۱۹۱۲ء میں نہیں ۱۹۰۹ء میں جزیرہ گئے تھے، اس سفر کی دو نظمیں جن کو کلیات میں دیباچے والے نے خلعت عطا کرنے میں بخل برتا گیا ہے پڑھنے کے قابل ہیں۔

بمقام جزیرہ :-

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہو گی تو کیوں ہو گی
خیال روزہ و شکر وضو ہو گی تو کیوں ہو گی

ہوئے روح پرور خود یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں ذکر مے و جام و سبو ہو گی تو کیوں ہو گی

جو دو دن بھی بسر کر لے گا اس قصر معلیٰ میں
اسے خلد بریں کی آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی

جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
کسی شے کی جو دل میں آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی

کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستاں
عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہو گی

[۱] ... شاعر کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے

مراجعت کے بعد ہی ۱۷ اکتوبر کو دوسری نظم لکھ کر بھیجی اور حق تو یہ ہے کہ مولانا
کی اردو نظموں میں یہ نظم لاثانی ہے۔

یادِ صحبت ہائے رنگیں جو جزیرے میں ہیں　　وہ جزیرے کی زمیں تھی یا کوئی میخانہ تھا
لطف تھا ذوقِ سخن تھا صحبتِ احباب تھی　　مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا
سبزہ و گل سے بھرا تھا دامنِ کہسار سب　　غیرتِ خلدِ بریں ہر گوشۂ ویرانہ تھا
غنچۂ گل کا تبسم تھا ہر اک دم برق ریز　　عندلیبوں کی زباں پر نعرۂ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہِ مستِ ساقی اس قدر　　خود بہ خود لبریز ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطفِ سخن　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ مولانا نے مثنوی صبح امید کو اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا
تھا اور بعض نظمیں اس لیے کلیات میں جگہ نہ پا سکیں کہ طبع غیور پر بار تھیں تاہم مصنف
حیاتِ شبلی نے مثنوی کو کلیاتِ اردو میں اور طبع غیور پر بار والی نظموں کو حیاتِ شبلی
میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ بعض ان نظموں کو جو مولانا کے جذباتِ قلبی کی
ترجمان اور فنِ شعر کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں ان کو کہیں جگہ نہ دی اردو نظموں میں وہ
دو قطعے (جو اسی باب میں مذکور ہیں) باوجود خطوطِ شبلی میں شائع ہو جانے کے کلیاتِ
اردو سے خارج کیے گئے یہی عمل ایک فارسی قطعہ کی نسبت کیا گیا جو عطیہ بیگم کو
بطور خط لکھا تھا۔ اسی طرح ایک غیر مقدم کی نظم ہے جس کے دو شعر مولانا کے خط
موسومہ مہدی حسن میں درج ہیں نظر انداز کر دی گئی۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا اور کچھ نہ کچھ تاویل کر لیجیے، مگر حیرت ہے کہ قابل شاگرد
"مصنف حیاتِ شبلی" نے دستۂ گل کی ایک نظم میں تحریف کا بھی کمال دکھلا دیا مولانا
نے بمبئی کے پُر کیف قیام میں ایک قطعہ عطیہ بیگم کو لکھ کر بھیجا تھا (خطوطِ شبلی ص ۱۲۱ میں
درج ہے) لیکن فرزند روحانی نے اس کو غزل بنا کر دستۂ گل میں پیش کیا۔ حالانکہ وہ

غزل کی تعریف میں بھی نہیں آتا اور کئی جگہ تحریف بھی کردی ہی پورا قطعہ حسب ذیل ہی
اور جہاں جہاں تحریف ہی وہ اسی کے تحت میں لکھ دی گئی ہی :-

(۱) نسیم صبح بیا و بہ مردمی پیش آ — پیام بندہ بہ آں خاکِ آستاں بہ رساں
تحریف نسیم صبح بیا، راحتے بجاں بہ رساں — (کس قدر بھدی تحریف ہی حالاں کہ محرف شاعر بھی ہیں)
(۲) متاع جاں دہم از بہائے مژدہ می خواہی — دگر نہ لطف بہ فرما و رائگاں بہ رساں
(۳) وفورِ شوق شکیبا نمی تواند شد — روا مدار درنگ و ہمیں زماں بہ رساں
(۴) حدیثِ شوق نہ چنداں کہ در بیاں گنجد — اگر نہ جملہ تواں آنچہ می تواں بہ رساں
(۵) تعرضے مکن از پیش خود در و چیزے — پیاں کہ با تو بگویم تو ہمچناں بہ رساں
(۶) بہ آستانۂ او سر بنہ و نزد وے ادب — درود گوئی و دعایم نہانی آں بہ رساں
(۷) بگو زمن تو بہ اعظم گڈھ آمدن گفتی — بیا و مرتبۂ من بہ آسماں بہ رساں
تحریف بگو کہ بر طبق وعدہائے پے در پے — (وعدہائے پے در پے بھرتی نہیں تو کیا ہی)
(۸) سلامِ شوق و دعائے بقائے دولت جاہ — بہ نازلی و بہ زہرا یگاں یگاں بہ رساں
تحریف سلامِ شوق و تمنا زبندہ نعمانی — بہ ساکنانِ در او یگاں یگاں بہ رساں

(زبندہ نعمانی کی تحریف و ترکیب کی داد دی جائے اور مجبوب کا دروازہ ہی یا کوئی کوچہ ہی)
مقطع کی تحریف میں تخلص تک بھی بدل دیا گیا، حالاں کہ دستۂ گل کی اور
دوسری نظموں میں شبلی ہی تخلص ہی بجز ایک غزل کے جو اس محرفہ نظم کے بعد درج
ہی اور کہیں "نعمانی" کا وجود نہیں اور یہ جو وہ بھی اس لیے معرض وجود میں لایا گیا کہ
پہلی تحریف و تبدیلی پہ ذہن رجوع نہ ہو —

حیات شبلی میں ایک باب سیاسیات بھی (۵۸۵ تا ۶۳۶) ہے، لیکن اس پر تبصرہ سے قبل مولانا شبلی کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنا ناموزوں نہ ہوگا۔

اس بات سے تعجب اور افسوس دونوں ہوتا ہے کہ پچھلی تعلیم جس کا اثر ابھی تک اب بھی ہندستان میں موجود ہے پولٹیکل آواز سے بالکل خالی تھی نصاب تعلیم میں ایسی کوئی کتاب داخل نہ تھی، تاریخیں کتابیں اگر پڑھائی جاتیں تو تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ فن انشا کے اعتبار سے، طالب علموں کی سادہ اور مفلسانہ طرز زندگی دنیوی خواہشوں سے مبرا اور بے غرض شوق، کمالات علمی کے لیے جس قدر مفید تھا اسی قدر اُن کو معاملات ملکی سے الگ رکھتا تھا، ہم کو تو جرأت نہیں ہوسکتی مگر علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں گو بیان سب میں ہم سے مختلف ہیں
ان العلماء من بین البشر ابعد الامم عن السیاسة"۔

(مقالات شبلی جلد سوم صفحہ ۸۹)۔

مولانا خود اسی تعلیم سے مستفید ہوئے تھے البتہ جب علی گڑھ کالج میں آئے تو چوں کہ یہاں سیاسی ماحول بھی تھا ممکن ہے ان کو سیاست سے بھی کچھ قرب ہوا ہو لیکن اُن کی زندگی میں ۱۹۱۱ء تک یعنی جب کہ وہ عمر کی چون منزلیں طے کر چکے تھے سیاسیات کی کوئی شعاع پردے کے اندر سے بھی چھن کر نظر نہیں آتی، کالج سے رخصت ہو کر وہ ایک ریاست میں ملازم رہے جہاں سیاسی آفتاب طلوع ہی نہیں ہوتا پھر ندوۃ العلما میں شامل ہوئے جس کے قواعد اساسی میں صاف صاف سیاست سے بے تعلق رہنے کا اعلان تھا۔

مصنف حیات شبلی نے اس باب میں ادیبانہ تمہید کے ساتھ بتایا ہے کہ ہندستانی سیاست میں اُن کے سامنے یہ مشکل تھی کہ "یہ ملک ہندو مسلمانوں کا متحدہ وطن ہے لیکن

اسلامی سیاست میں وہ پورے پین اسلامی تھے" اس کے بعد مابین الاسلامی سیاست میں ترکوں سے محبت کا عنوان دے کر ۱۸۷۷ء کی جنگ روم و روس میں چندہ: ٹرکی کے سفر اور سفرنامہ کی ترتیب وغیرہ کی تکرار بیان کے بعد ایک نئی بات لکھی ہے کہ

"۹۶-۱۸۹۵ء میں جب آرمینیا کا مسئلہ اٹھا اور اس سلسلے میں یورپ کا ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بافی کر کے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھیرا رہا تھا اور ہندستان کے اخباروں میں اس کی نقلیں چھپ رہی تھیں تو مولانا سے ضبط نہ ہوسکا انھوں نے ۲۱ر فروری ۱۸۹۶ء کے آزاد اخبار لکھنؤ میں ایک زبردست مضمون لکھا اور حقیقت کا پردہ چاک کیا یہ وہ وقت تھا جب وہ علی گڑھ کالج کی ملازمت میں تھے" (۵۸۷)

مصنّف نے نہ صرف لایعنی مبالغہ کیا ہے بلکہ علی گڑھ پر بھی ایک حملہ کر دیا ہے، مگر اس زمانے کے اخبارات دیکھے جائیں تو یہ شہادت ملتی ہے کہ انگلستان میں ہی مفروضہ مظالم آرمینیا کے پروپاگنڈا کا جواب وہاں کے اخبارات میں شائع ہوتا رہتا تھا جس میں بعض اعلیٰ مرتبے کے انگریز بھی ہم آہنگ ہوتے تھے مثلاً مئی ۱۸۹۵ء میں مسلمانانِ لندن نے ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا تو اس میں برطانوی بیڑے کے ایک ایڈمرل اور ایک معزز ممبر پارلیمنٹ نے نہایت زبردست تقریریں کیں جو اُن کے تجربات اور ذاتی معلومات پر مبنی تھیں ایڈمرل کی تقریر تو نہایت معرکہ کی اور ایک مشہور مخالف ترک کے پروپیگنڈے پر ضرب کاری تھی یہ دونوں تقریریں مدراس کے انگریزی اخبار "محمڈن" میں شائع ہوئیں جو لندن کے اخبارات سے منقول تھیں اور سرسید یا کالج ہی کے اخبار میں مع ترجمہ اُردو چھاپی گئیں، جولائی ۱۸۹۶ء کے تہذیب الاخلاق میں بھی منشور سلطانی کا عربی متن اور اُردو ترجمہ (وحید الدین سلیم کا کیا ہوا) شائع ہوا۔ یہی زمانہ تھا کہ لورپول کے نومسلم مسٹر عبد اللہ کوئیلم

نے اپنے اخبار کریسینٹ میں سوڈان کے متعلق مسلمانان عالم کے نام ایک پیغام شائع کیا تھا کہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد نہ دی جائے اس کا ترجمہ بھی اخبارات میں شائع ہوا غرض تمام مسلمان اخبارات ایسے ہی مضامین سے بھرے ہوتے تھے اسی زمانے میں ایک مستقل کتاب "TAE LO-CALLED ARMINIAN ATROCITIES" انگلستان میں شائع ہوئی جس کا ترجمہ "مفروضہ مظالم آرمنیا" کے نام سے اردو میں چھاپا گیا، یہ تو اس زمانے کی حالت تھی اب مولانا کے مضمون کی حقیقت دیکھیے جس میں حقیقت کا پردہ چاک کیا گیا ہے، یہ مضمون بیروت کے اخبار ثمرات الفنون کے ایک آرٹیکل کا پورا ترجمہ بھی نہیں بلکہ تلخیص ہے اور اس اصل مضمون کا ماخذ بھی ایک فرانسیسی اخبار ہے۔ مولانا کا یہ ملخص مقالاتِ شبلی[1] کے چار صفحات میں آیا ہے اور اسی میں انھوں نے ظاہر بھی کر دیا ہے کہ یہ تلخیص ہے۔

ایک دوسرا رخ بھی اس جوش و اضطرار کا ملاحظہ ہو، ندوۃ العلما کے جلسے ۱۸۹۵ء کی روئداد جو مولانا نے لکھی ہے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہے جلسہ ختم ہونے کے وقت یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ ندوۃ العلما کے جلسے اور اس کی تمام کارروائیاں ختم ہوگئیں اور اگر کل کوئی کارروائی یہاں ہوگی تو اس کو ندوہ سے کچھ تعلق نہ ہوگا اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ دوسرے دن بعض آدمیوں نے شاہ مینا میں ایک مجمع کرنا چاہا تھا (اور کیا بھی) جس میں وہ مسئلہ آرمینیا اور قوانین حجاج کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

---

[1] مصنف حیاتِ شبلی کی یہ جسارت بھی قابلِ داد ہے کہ بعض ایسے مضامین جو دوسروں نے لکھے اور مولانا نے ان کے ترجمے یا تلخیص کو چند تعارفی سطور کے ساتھ الندوہ میں شائع کیا وہ بھی مولانا کے مقالاتِ مذہبی میں شامل کر لیے گئے، (۱) الاسلام صفحہ ۱۲۴ تا ۱۶۷ میں مولانا کے صرف دو صفحے ہیں اور پورا مضمون عربی کتاب کا ترجمہ ہے یہ عربی کتاب خود بھی فرانسیسی زبان سے ترجمہ ہے (۲) قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں ۲۸ تا ۴۴ مولوی حمیدالدین کے مضمون کی تلخیص مولانا نے تعارفی سطور میں ترجمہ و تلخیص کو ظاہر بھی کر دیا ہے۔

ہم کو افسوس ہے کہ باوجود اس کے ایڈووکیٹ، لکھنؤ کے اخبار نے اس امر میں غلطی کی اور شاہ مینا کے جلسے کا ذکر ایسے پیرائے میں کیا جس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ جلسہ ندوۃ العلما سے تعلق رکھتا تھا، سوال ہو سکتا ہے کہ اس وقت مولانا کا وہ اضطراب اور وہ جوش کہاں تھا اور کیوں وہ اس جلسے میں شریک نہ ہوئے اور روئداد میں اس سے برأت کی کیا وجہ تھی۔

اس کے بعد طرابلس کی لڑائی کا تذکرہ ہے جو آخر ستمبر ۱۹۱۱ء میں شروع ہوئی لیکن یہ تذکرہ طرابلس کی خودمختاری شیخ سنوسی اور انور بے کے اعلانات کے ذکر اور اس واقعے کی خوشی میں مولانا کا چند طلبا کو بلا کر مٹھائی کھلانے کے ذکر تک محدود ہے مگر کوئی ایسا نشان درد و جوش نظر نہیں آتا جس سے طرابلسی عربوں کے مصائب کا تاثر معلوم ہو، البتہ اپریل ۱۹۱۲ء کے اجلاس ندوہ میں جس کی صدارت علامہ رشید رضا نے کی اور جس کا انعقاد مولانا کے مفاخر میں ہے جو تجاویز پاس ہوئیں ان میں یہ اہم تجاویز دیکھتے ہیں (۱) ملک معظم کی رونق افروزیِ ہند پر خوشی و مسرت (۲) ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال ہز ہائی نس نواب رام پور ہز ہائی نس آغا خان کو خطابات کی مبارکباد (۳) گورنمنٹ کا شکریہ کہ اس نے اٹلی کو جدّہ اور ینبوع پر کسی قسم کی کارروائی کرنے سے باز رکھا۔ مگر دوسری طرف دیکھیے اسی غلام آباد علی گڑھ میں طرابلسی عربوں کی ہمدردی میں طلبا اور اسٹاف اور آنریری سکریٹری کالج نے خاص طور پر چندے کیے۔ طلبا نے ہفتے میں جو اچھا کھانا معین تھا اس کو ترک کر دیا اور اس سے جو پس انداز ہوا یعنی تقریباً پانچ سو روپے ماہانہ وہ طرابلس فنڈ کو دیا اکثر نے تمام آرائشی سامان اور قیمتی ملبوسات فروخت کر کے اُن کی قیمت طرابلس فنڈ میں داخل کی اسٹاف نے اپنے کلب کا سارا اسی فنڈ میں منتقل کر دیا غرض مئی ۱۹۱۲ء تک ۶½ ہزار روپیہ مظلومان طرابلس کی امداد میں بھیجا گیا (تاریخ کالج و انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۹۱۲ء)

جنگ بلقان کے متعلق جو اکتوبر ۱۹۱۲ء میں شروع ہوئی مصنف خیابات لکھتے ہیں کہ "اس زمانے میں اس تحریک کی راہنمائی جن لوگوں نے کی ان میں ایک نام ہمارے ہیرو کا بھی ہے شہر آشوب اسلام کے نام سے غم و حسرت بھری ایک ایسی نظم لکھی جس نے اس حادثے پر مسلمانوں کے دامن کو آنسوؤں سے تر کر دیا" (۱۹۵ حیات)
یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے مولانا کی کوئی رہنمایانہ حرکت اور اقدام نہیں، دیگر متعدد شعرا نے بھی جگر گداز نظمیں لکھیں اس تحریک کے اصلی رہنما علی گڑھ کالج کے قدیم اور جدید طلبا تھے اور کالج کا سکریٹری، قدیم طلبا میں جنگ طرابلس کے وقت ہی سے مولانا ظفر علی خاں نے رہنمائی کی اور ایسی کہ مولانا حالی نے اس کے اعتراف میں "در تشکر مساعی ظفر علی خاں" کے عنوان سے ایک[۱] نظم لکھی۔ جنگ بلقان میں مولانا محمد علی منظر پر آئے اور انصاری طبی مشن کا اہتمام کیا جس میں کالج کے طلبا اور اشاف نے ہزاروں روپیہ سے ہی مدد نہیں کی بلکہ متعدد نوجوان اپنی تعلیم ملتوی کر کے خدمت کے لیے طبی مشن میں شریک ہو کر ترکی گئے۔ حقیقت میں صرف علی گڑھ ہی ایسا ادارہ ہے جس کی تاریخ میں ابتدا سے ترکی تعلقات نہایت شان دار

---

[۱] چند شعر (۱) اے صدق و صفا کی زندہ تصویر ۔ اے شیر دل اے ظفر علی خاں
(۲) بلقان و طرابلس میں ناگاہ ۔ اٹھا ستم و جفا کا طوفاں
(۳) ہم دردیِ اہلِ دیں نے آخر ۔ جو ہر ترے کر دیے نمایاں
(۴) پھیلے وہ بشکلِ سیلِ آتش ۔ دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں
(۵) ڈالا یہ تری پکار نے غل ۔ جی اٹھے وہ مردے جو تھے بےجاں
(۶) جو دل عجم قوم سے تھے بےحس ۔ چلنے لگیں ان دلوں پہ چھریاں
(۷) ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ ۔ سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں
(۸) نازاں ہے وہ درسگاہ تجھ پر ۔ تعلیم پہ جس کے تو ہے نازاں

نظر آئیں گے جنگ بلقان کے ختم ہونے پر ترکی مشن اور خلیل خالد اور پھر ۱۹۱۳ء میں
مشہور امیر البحر رؤف بے نے سرسید کے ہی کالج میں آکر اعترافات ہمدردی کیے۔

مصنف نے ترکی ہمدردی کو صرف تین نظموں تک محدود کر کے اسٹیشن
لکھنؤ سے ڈاکٹر انصاری کی روانگی کا یہ سماں دکھلایا ہے :۔

"ڈاکٹر صاحب ڈبے کے دروازے پر کھڑے ہوئے وداعی سلام کر رہے
ہیں کہ دفعتاً اس ہمہ تن گوش علامۂ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں
کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا دفعتہً ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا
آنسوؤں نے اس کے گرد وغبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے
لیے اور گاڑی اسلامی حمیت وغیرت کے ان گہرہائے گراں مایہ کو
لے کر آگے بڑھ گئی۔" (۵۹۵ حیات)

بلاشبہ عبارت ادیبانہ ہے لیکن واقعیت سے خالی، اوّل تو علامہ وقت کو
کسی معمولی جبار سے بھی سابقہ نہیں پڑا کہ سر کا جھکنا نہ جھکنا معلوم ہوتا۔ تاہم ندوہ
کے جلسۂ سنگ بنیاد میں خود مولانا لکھتے ہیں کہ "مقدس علما عیسائی فرماں روا کے
سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے" ان مقدسین میں مولانا کی ذات
گرامی بھی تھی، پھر دربارِ دہلی کے موقع پر درشن جھروکے کے سامنے شاہ کی بارگشتی
میں ایسی ہی تعلیم کا مظاہرہ فرمایا۔ مگر اسٹیشن لکھنؤ اور ڈاکٹر انصاری کی قدم بوسی
یہ تو واقعہ ہی سرے سے غلط معلوم ہوتا ہے مصنف کو زور بیان میں یہ خیال نہیں
رہا کہ مولانا کا ایک پاؤں مصنوعی تھا اور وہ لکڑی کے سہارے چلتے تھے اور ان
کو ایک کھڑے ہوئے آدمی کے بوٹ تک جھکنے کے لیے پہلے سے ارادہ کرنے
اور اہتمام کی ضرورت تھی دفعتاً جھک کر لبوں سے بوٹ کو بوسہ دینا ممکن ہی نہ تھا
مسلم سلیکسا میں مولانا کا احترام و وقار تھا لوگ اُن سے محبت کرتے تھے اگر دفعتاً جھکتے تو

وہ اتفاقیہ گر پڑنے کی شکل ہوئی اور تمام مجمع میں اضطراب پھیل جاتا اور مولانا کو سنبھالنے کی کوشش ہوتی۔

مولانا کی یہ بین اسلامی سیاست بس انھی چند نظموں پر ختم ہو جاتی ہے ۱۸۷۷ء کی طرح چندہ جمع کرنے ترکی تمسکات[1] کی خریداری کی کوشش اور مصنوعات ترکی کی نمائش[2] وغیرہ میں، وہ کہیں نظر نہیں آتے، ان نظموں میں بھی خلافت و خلیفہ کا نہیں بلکہ حکومت اور دولت عثماں کا ماتم ہے حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کب تک (اور) زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے۔

اب مصنّف نے مسجد کان پور کے ہنگامے کو شرح و بسط کے ساتھ لکھ کر مولانا کی ان نظموں کو نقل کیا ہے جو اس ہنگامے کے متعلق انھوں نے لکھی تھیں اس ضمن میں لکھتے ہیں :-

کان پور کے محلے مچھلی بازار میں ایک مسجد بر سر راہ تھی وہاں سے شہر کی میونسپلٹی نے ایک نئی سڑک نکالی جس میں مسجد کا ایک حصہ جو وضو خانہ تھا بیچ میں آگیا اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کو منہدم کر دیا گیا حالانکہ اس کے پاس ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا جس کو بچا کر یہ سڑک نکالی گئی اس واقعہ نے تمام مسلمانوں میں ایک آگ سی لگا دی۔ ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو جب رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی مسلمانان کان پور نے مولانا عبد القادر آزاد سبحانی مدرس اعلیٰ مدرسہ الہیات کان پور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جلسہ میں کافی جوش و خروش پیدا ہوا جلسے کے بعد پرجوش مسلمانوں نے جن میں بچے[3] بھی تھے مسجد کا رُخ کیا اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چن چن کر رکھنے لگے مسٹر ٹائلر ڈپٹی کمشنر کان پور نے

---

[1] ڈاکٹر انصاری نے ان کے فروخت کی کوشش کی اور نواب وقار الملک نے اس میں اعانت کی تھی
[2] ڈاکٹر انصاری نے اہتمام اور وقار الملک نے افتتاح کیا تھا۔
[3] بچے ا[illegible] وغیرہ "[illegible]" ہے۔

یہ دیکھ کر مسجد پر متعین سکھ فوج کو ان نہتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ فوجی پولس کے سپاہیوں اور سواروں نے ان پر نہایت بے رحمی سے دور سے گولیاں برسائیں اور قریب سے برچھے مارے شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے بچے بھی شامل تھے، اس خونیں واقعے نے ہندستان کے مسلمانوں میں ہیجان و اضطراب بپا کر دیا، مسلمان ہی اور اُن کے قائد مولانا آزاد سبحانی گرفتار کیے گئے اور ان پر مقدمات چلائے گئے عام مسلمانوں نے ان مظلوموں کی امداد کے لیے چندہ کیا اور قانون پیشہ مسلمانوں نے عدالتی پیروی کے لیے خدمات پیش کیں، اس واقعہ پر مولانا نے متعدد نظمیں لکھ کر اخبارات میں شائع کرائیں، اس ہیجان و جوش کے نتیجے میں حکومت صوبہ اور حکومت ہند دونوں کو تردد ہوا اور مصالحت کی سلسلہ جنبانی شروع ہوئی اس پر بھی مولانا نے ایک نظم لکھی جس کے چند شعر اس سلسلہ بیان میں پڑھنے کے قابل ہیں:

۱۔ لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادہ صلح — یہ اگر سچ ہے تو جز خوبی تقدیر نہیں

۲۔ لیکن انعام گراں قدر و ظائف کی طمع — یہ حقیقت میں صلح کی کوئی تدبیر نہیں

۳۔ مابہ البحث اگر ہے تو فقط مسجد ہے — دیت قتل شہیدان جواں گیر نہیں

۴۔ جزِ مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر — آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں

۵۔ آپ کہتے ہیں وضو خانہ تھا مسجد تو نہ تھی — یہ بجا مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں

۶۔ آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ — حامل فقہ نہیں واقف اسرار نہیں

بالآخر مصالحت ہوگئی ۱۴ر اکتوبر کو والیسرائے ہند خود کان پور آئے لا ممبر حکومت ہند سر علی امام نے حکومت کی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مسلمانوں کی نیابت کی اور معاملہ طے ہوگیا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے مقدمے واپس لے لیے جائیں اور مسجد جو بلندی پر تھی اس کے ٹوٹے ہوئے حصے کو اس طرح بنا دیا جائے

کہ اوپر چھت دے کر وضو خانہ پھر قائم کر دیا جائے اور چھت کے نیچے سے سڑک کی آمد و رفت کا راستہ رہے۔"

اس تصفیے پر مولانا نے والیسرائے کو خطاب کر کے حسب ذیل قطعہ میں اپنی شکر گزاری کا فرض ادا کیا۔[۵۱] ......اور مولانا ابوالکلام کو جو اس زمانے میں مسلمانوں کے سب سے مقبول رہنما اور اس تحریک کی جان تھے لکھا[۵۲]۔ "برادرم کان پور کا معاملہ جس طرح ہوا فیصل ہو گیا اب سردست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں" (ملاحظہ ہو حیات ۶۰۰ تا ۶۰۷) غرض ہندستان میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کی تاریخ میں یہ واقعہ متعدد حیثیتوں سے ذکر کے قابل ہے"

مولانا اس وقت بمبئی میں تھے،" انھیں اس کا غم تھا کہ وہ بمبئی میں کیوں تھے ؎
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے"

اس کا کیا جواب ہے کہ مولانا نے ان آوازوں پر مطلق کان نہ دھرا اور بمبئی کے پر فضا اور حسین منظروں میں نالہ ہائے موزوں تک ہی اپنی ہم دردیوں کو محدود رکھا، دراصل یہ واقعہ اور اس مصالحت و شکریے میں بہت سی بصیرتیں اور عبرتیں ہیں۔ پہلے وضو خانے کو جزو مسجد کہا گیا اس پر فنا دے ہوئے غریب اور پر جوش مسلمانوں نے جانیں قربان کیں عورتیں بیوہ ہوئیں بچے یتیم ہوئے اور روپیہ الگ صرف ہوا مگر نتیجہ ؎

از صحنِ خانہ تا بہ لبِ بام ازانِ من — وز سقفِ خانہ تا بہ ثریا ازان تو

---

۵۱ یہ قطعہ شکر گزاری کلیات اور حیات میں موجود ہے آخر کے دو شعر یہ ہیں ؎

گرچہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی — شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے
تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اوراق شناس — ان میں یہ پیش کشِ شبلی نعمانی ہے

۵۲ یہ خط ۲۰/ اکتوبر کا ہے۔

اگر درحقیقت فقہ کا مسئلہ یہی تھا کہ مسجد وضوخانہ کی زمین جزو مسجد نہیں، خواہ اس پر وضوخانہ ہو یا غسل خانہ تو اس قربانی کی ضرورت کیا تھی صرف دالان کی چھت پر قبضے کو فوزِ عظیم اور فتح مبین سمجھ لیا گیا اور "اس زمانے کے معلّمِ اوّل حامل فقہ" (شبلی) نے مسئلہ فقہ کی صحیح تعبیر سمجھ کر تشکریے کا فرض ادا کر دیا اور تحریک کی جان سرد پڑ گئی جزو متنازعہ آج بھی سڑک کی صورت میں ان علمائے دین کے تفقہ کی خونیں یادگار کے طور پر قائم ہے اور ہر راہ رو کو مسئلہ فقہ کی تعبیر بتا رہا ہے۔

اب مصنف سیا سیاتِ ہند کا عنوان قائم کرکے ملکی معاملات میں مولانا کی آزادی اور سیاست میں فطری صلاحیت اور سرسید سے سیاسی اختلاف کو (جو پہلے بھی بیان ہو چکا ہے) ایک روایت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "سرسید نے لکھنؤ میں کانگرس کے خلاف جو مشہور تقریر کی تھی مولانا نے نام چھپا کر علی گڑھ گزٹ میں اس کا جواب لکھا تھا" لیکن مولانا نے کہیں اشارۃً تک نہیں کیا نہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں کوئی ایسا مضمون شائع ہوا۔

اس کے بعد اقرار ہے کہ "با ایں ہمہ مولانا کی سیاست ابھی تک مجلسی بحث سے آگے نہیں بڑھی تھی وہ اپنی مجلس میں بیٹھ کر کانگرس کے مطالبوں پر رجز خوانی اور مسلمانوں کی سیاسی گم راہی کا ماتم کیا کرتے تھے اور بس۔ اردو اخباروں میں "ہندستانی" لکھنؤ کو جسے لکھنؤ کے کانگریسی لیڈر گنگا پرشاد ورما نکالتے تھے بہت شوق سے پڑھتے تھے اور اس سے اثر لیتے تھے لیکن دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ نے وفعتہً بتوں کی مُہر کو توڑ دیا نواب وقار الملک کے مضمون کے بعد جو دوسرا بہادرانہ مضمون اس انقلاب کی بشارت لے کر نکلا وہ مولانا شبلی ہی کا تھا جس کی سُرخی "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ ہے"۔ آگے چل کر اخبار مسلم گزٹ کے اجرا مولوی وحید الدین سلیم کی ادارت اور ان سے قدیم اختلاف اور مسلم گزٹ

اور اخبار میں مولانا کے مضامین لکھنے اور پھر مولوی سلیم سے اختلاف اور مسلم گزٹ میں مولانا کے خلاف مضامین کی اشاعت اور مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ"[1] کے چار نمبروں کی اشاعت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون اس قدر مدلّل اور پُرجوش تھا کہ اس نے مسلمانوں کی سیاست کا رُخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا" اس کے بعد مضمون کے اقتباسات درج ہیں اور ان کے بعد ادّعا ہے کہ "بہرحال اس کا کوئی شبہ نہیں کہ لیگ میں اس وقت جو کچھ انقلاب پیدا ہوا اس میں دوسرے اسباب کے ساتھ مولانا کے نشتر ریز قلم کا بھی کچھ کم حصّہ نہیں" اس کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد ۱۹۱۵ء کو مولانا کی ایک نظمیہ پیشین گوئی بتایا ہے۔

مصنّف کو خود اقرار ہے کہ مولانا کی سیاست ابھی تک مجلسی تھی اور اس کے بعد بھی مجلس سے نکل کر صرف میدان صحافت تک اور وہ بھی چند روزہ ان کے قلم کی تنگ دو دو تک محدود رہی، اگر مسلم لیگ کی تاریخ پر سنہ ۱۹۰۶ء تا سنہ ۱۹۱۲ء نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس نے سیاسیات ہند میں بتدریج قدم بڑھایا اور سنہ ۱۹۱۰ میں ہی وہ ایسی پوزیشن میں آگئی کہ کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل ہو چنانچہ اس سال کے صدر کانگریس سرولیم ویڈربرن اور ہز ہائی نس آغاخان کے تبادلۂ خیالات کے نتیجے میں ایک اتحاد کانفرنس کی تجویز ہو چکی تھی

---

[1] مولانا شبلی کا یہ مضمون اُن کے مقالات میں شائع ہوا ہے جہاں تک ادیبانہ سخن طرازی کا تعلق ہے خوب ہے لیکن حقائق اور نفسِ سیاست کے اعتبار سے بہت کچھ محلِ نظر و انتقاد ہے۔ سرسید پر جو اعتراضات ہیں وہ غیروں کے دسترخوان کی ریزہ چینی ہے، اب مابعد غدر مسلمانوں کی سیاسی تاریخ پر سے پردہ اُٹھ چکا ہے متعدد مُستند تاریخیں شائع ہو چکی ہیں ان کو پڑھنے سے سرسیّد کی دُور بینی اور اُن کے جانشینوں کی کانگریس میں مدغم نہ ہونے کی جد وجہد کی عظمت معلوم ہوتی ہے، اس معلومات کے لیے سیاستِ ملیہ (اُردو) اور مسلم انڈیا (انگریزی) قابلِ مطالعہ ہیں۔

اور اجلاس سالانہ مسلم لیگ منعقدہ ناگ پور کے ختم ہوتے ہی مسلم سیاسیین ہز ہائی نس اور وقار الملک (بانی مسلم لیگ) کی قیادت میں اسپیشل ٹرین کے ذریعے الہ آباد آئے جہاں کانگرس کا اجلاس ہو رہا تھا چالیس مسلم اور ساٹھ ہندو سیاسیین نے بحث و مباحثہ کے بعد متنازعہ امور پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنادی، لیکن اس کمیٹی کے نتیجے سے پہلے ہی طرابلس و بلقان کے واقعات سے جو دل زخمی ہو رہے تھے ان پر تنسیخ بنگال نے اور سخت چرکے دیے، ہندوؤں نے اس تقسیم کی تنسیخ پر انتہائی خوشی منائی اور صدر کانگرس (۱۹۱۱ء) نے حکومت کے سامنے وہ گہرہائے عقیدت پیش کیے کہ سرسید کے تو خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے اور صاف لفظوں میں برطانوی راج کو خدا کی نعمت قرار دیا، اسی طرح ایک دو ممتاز لیڈر نے کہا کہ "ہر شخص کا دل برطانوی تاج کی وفاداری اور عزت کی خوشی میں رقص کر رہا ہے"

بہرحال وہ کمیٹی بلا نتیجہ رہی -

اب اس تنسیخ تقسیم پر جب کہ یہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر وقار الملک نے ایک انقلاب آفریں مضمون شائع کیا جس میں روح انقلاب یہ فقرہ تھا کہ "یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہو کہ اِن واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمان کو گورنمنٹ پر بھروسا کرنا چاہیے لاحاصل مشورہ ہو اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہیے وہ ہماری اپنی قوت بازو ہو" یہ مضمون تھا جو فوراً ہی طول و عرض میں شائع ہوا اور اینگلو انڈین اور کانگریس پریس[1] میں بحثیں شروع ہوئیں۔ اور کامریڈ (انگریزی اخبار جو مولانا محمد علی شائع کرتے تھے) نے معترضین کو دندان شکن جوابات دیے، مولانا شبلی نے تو تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد میدان صاف

---

[1] کانگریس پریس نے گورنمنٹ کو دھمکی سے تعبیر کیا -

دیکر کردہ مضمون لکھا تھا جس کی اشاعت مسلم گزٹ اور دو چار مسلم اخبارات تک محدود رہی مضمون کی نسبت خواہ کتنی ہی تعریف کی جائے مگر یہ حقیقت اٹل ہے کہ مولانا سیاسی اعتبار سے قوم میں متعارف تک نہ تھے نہ وہ کبھی کسی سیاسی انجمن میں رکن خاص یا عام ممبر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے اس لیے صرف ایک مضمون سے شملہ کی طرف سے قبلہ کی طرف منھ پھیر دینا معجزہ ہی ہوسکتا ہے منھ پھیرنے والے وہی لوگ تھے جو سیاست میں پیرے ہوئے تھے، مولانا کو مصنف حیات شبلی میں خواہ کتنا ہی " رستم دستاں " بنائیں مگر تاریخ سیاست میں تو وہ " یلے در سیستاں " بھی نہیں، ایک ربع صدی گزرنے پر جب کہ اقوام و ممالک کی سیاست کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے سرسید کی سیاست پر جو ایک موقت اور مقتضیات وقت پر مبنی تھی اعتراضات کرنا سعی لاحاصل اور کوشش بے نتیجہ تھی، تاہم سیاست میں بھی کچھ غیر تغیر پذیر اصول ہوتے ہیں اور ان ہی پر اقوام و ممالک کا انحصار زندگی ہوتا ہے سرسید کی سیاست میں یہ اصول کہ مسلمان ہندستان میں ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن کے مخصوص مفادات ہیں جیسا کہ ۱۸۸۵ء میں اپنی جگہ صحیح تھا ویسا ہی آج بھی صحیح ہے اور بعدہٗ کانگریس کے ساتھ اتحاد و افتراق نے اس کی اور زیادہ صداقت منوا دی ہے۔ حکومت کے ساتھ وفاداری کی تلقین نہ صرف اس زمانے میں سرسید نے کی بلکہ اس زمانے میں بھی جب کہ اس تلقین پر اعتراضات کی بوچھار تھی۔ ہندستان کی سب سے بڑی آزاد اور مولانا کی ممدوح انجمن نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے بھی یہی تلقین کی جارہی تھی۔

اس سے آگے تیز رو جماعت احرار کا تذکرہ کرکے مصنف لکھتے ہیں کہ "حریت خیال کے مسافر نے یہاں تک منزل طے کی تھی کہ بہت سے کہنہ سال

وفاداران قوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے نوجوانوں کی خیرہ سری ہمارے ازلی آقاؤں کو ہم سے سرگرداں نہ کر دے اور طرابلس، بلقان، کان پور اور یونی ورسٹی کے معاملات میں ہماری آزادہ گوئی اور مسلم لیگ کے انقلاب، مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد اور لکھنؤ پیکٹ وغیرہ میں ہماری سیاسی آزادہ روی سے حکومت وقت کے دل میں ہماری طرف سے غلط فہمی نہ ہو اس لیے بظاہر ضلع کان پور کے شکریے میں اور درحقیقت مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلانے کی خاطر مہاراجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی میں ایک ڈیپوٹیشن ترتیب دیا گیا جس میں حزب الاسرار کے بھی بعض نام ور اصحاب نے افسوس ہے کہ شرکت کی اور گویا انھوں نے اس طرح اپنے پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کیا اس وفد نے ۵ اراپریل ۱۹۱۴ء کو وائسرائے سے ملاقات کی اور ایک ایڈریس پیش کیا لیکن مولانا ابوالکلام اور بعض دوسرے افراد نے اس وفد سے قطعاً احتراز کیا اور اس کے خلاف سخت مضامین لکھے" (۶۲۹)

اس کے بعد مولانا کی چند اسی قسم کی نظمیں درج کی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ مصنف حیات شبلی نے اس زمانے کی سیاسی حالت کو کچھ بھی نہیں سمجھا اور یہاں تک غلطی کی ۱۹۱۴ء کے ڈپوٹیشن کے سلسلے میں لکھنؤ پیکٹ کا بھی ذکر کر دیا جو ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا، اس وقت صورت حال یہ تھی کہ انگریزی اخبارات مسلمانوں کے سیاسی رویے کے متعلق بہت ہی مخالفانہ مضامین لکھ رہے تھے اور انگلستان کے بعض اخبارات (لندن ٹائمز اور نیشنل ریویو) بہت زیادہ زہر اگل رہے تھے اور مسلمانوں کی نسبت گورنمنٹ سے ناراضی اور باغیانہ خیالات کی اشاعت کی جا رہی تھی۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں وائسرائے نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں جو تقریر

کی تھی اس میں ٹرکی اور برطانیہ کے تعلقات اور ایمان کی حالت کے متعلق بھی ایک بیان تھا جس کے آخر میں یہ بھی کہا تھا کہ " اب میں مسلمانانِ ہند سے ایک کلمۂ دوستانہ انتباہ ونصیحت کا کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ان کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ ایک عظیم سلطنت کا جزو ہیں لہذا اُن کو اسلام کے ایک جسم واحد ہونے کے دعوے کا کوئی ناواجب مفہوم نہیں قرار دینا چاہیے میں نہایت دوستانہ پیرائے میں ان کے یہ ذہن نشین کروں گا کہ ان کو اپنے اندر مناسب قوتِ فیصلہ۔ ضبطِ نفس اور وسعتِ نظر ان مسائل کی نسبت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے جو مجموعی طور پر سلطنت کی بیرونی پالیسی پر موثر ہوتے ہیں "

اسی زمانے میں یورپ کا مطلع امن تاریک ہو رہا اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈا بھی پُر زور ہوتا جاتا تھا اس لیے ہر نقطۂ خیال کے لیڈروں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ ایک مستند طریقے سے ان شکوک وشبہات کو دُور کیا جائے اور اپنے وفادارانہ رویّے کا یقین دلایا جائے چنانچہ اپریل میں نہیں بلکہ مارچ میں ایک مقتدر ڈپوٹیشن وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک ایڈریس پیش کیا جس میں موجودہ سیاسی تحریک کی تاریخ مُسلم یونی ورسٹی کے قیام کی کوشش اور حیرت انگیز تواتر کے ساتھ جو واقعات کہ اس دو تین سال میں پیش آئے تھے ان کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"حضور والا یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اس ملک کے مسلمانوں پر ان کا گہرا اور دردانگیز اثر نہیں ہوگا، تمام مشاہدہ کرنے والوں پر یہ بات روشن ہوگی کہ ایسے افسوس ناک واقعات کے اجتماع کی مثال گزشتہ زمانے

میں بالکل نہیں مل سکتی خود حضور حق کی ہمدردی ہمارے کثرت مصائب میں ہمارے ساتھ تھی ہمارے اس تاریک زمانے کے احساسات کی تیزی اور حدت سے بخوبی واقف ہیں لیکن کوئی آدمی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کرسکتا جو اس طرف دور کا اشارہ بھی کرتی ہو کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اس غیر معمولی دشواری کے موقع پر اپنی قوت تمیزی اور ضبط کو ہاتھ سے جانے دیا ہو یا تخت برطانیہ یا ہز مجسٹی کی ہندستانی قانونی حکومت کے ساتھ اپنی محکم اور مضبوط روایتی وفاداری سے ایک سرمو بھی تجاوز کیا ہو ہم نے نہایت تکلیف اور معاندانہ نگاہوں سے ان قابل افسوس کوششوں کو دیکھا ہے کہ جو باوجود ان مسلمہ واقعات کے حال میں بعض حلقوں میں ہماری قوم کو بدنام کرنے اور گورمنٹ کے ساتھ جو ہمارے تعلقات ہیں اُن کے غلط معنی پہنانے اور حضور ملک معظم کی تمام مسلمان رعایا کی نیتوں اور چال چلن کو دھبہ لگانے کے لیے اس غرض سے کی گئی ہیں تاکہ گورمنٹ اور برطانوی رعایا کی نگاہوں میں تحقیر کی جائے۔ یہ بات کھلم کھلا بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے لیڈر مذہبی جذبات کو مشتعل کرتے ہیں، قومی منافرت کو بڑھاتے ہیں اور برطانوی حکومت کی بدگوئی کرنے اور عیسائی مذہب کو بدنام کرنے کا کوئی موقع اُٹھا نہیں رکھتے اور ایک نئی جماعت یہ خیال کرنے لگی ہے کہ انگریزوں کو ہندستان سے نکال دیا جائے۔ یہ بیان بھی کیا گیا ہے کہ اس نئی مسلم تحریک کا ایک شرانگیز پہلو یہ ہے کہ علی گڑھ کے گریجویٹ پیش پیش ہیں اور حکومت برطانیہ کی مخالفت علانیہ پھیلانے اور مسلمان افواج کی وفاداری کو کم زور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

"حضور والا! بڑے بڑے عام جوش کے موقعوں پر متواتر امتحان میں پورے اُترنے کے بعد ایسے وقت میں جب کہ ہم ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہو رہے تھے اور اس ہمدردی اور خلوص کے محتاج تھے جس کے ہم مستحق تھے ہم کو ایسے بے رحمانہ حملوں کی ہرگز اُمید نہ تھی، حضور ملک معظم کی ۷ کروڑ وفادار مسلمان رعایا کی نیک نامی پر جس بدنیتی کے ساتھ حملے کیے گئے اگر ہم اس کی تردید میں کوئی تیز فقرہ استعمال کرنے پر مجبور ہوں تو ہم کو اعتماد ہے کہ حضور ہم کو معذور تصوّر فرمائیں گے ہم اپنی قوم کی طرف سے بلا تامّل ان الزامات کو غلط اور بے بُنیاد قرار دیتے ہیں جو سلطنت کی بہترین اغراض کے لیے سخت مُضر ہیں معمولی صورتوں میں قوموں یا افراد پر غیر ذمہ دارانہ حملوں کے ساتھ، حقارت آمیز خاموشی کا برتاؤ ہو سکتا ہے، لیکن جن لوگوں نے ہماری قوم کو بدنام کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے وہ وسیع ذرائع رکھنے والے اور اپنی بات پر اَڑنے والے لوگ ہیں اور ان کی شر انگیز کوششوں کو اس کثیر اشاعت سے اور بھی زیادہ مدد پہنچی ہے جو ان کے الزامات کو انگلستان اور ہندستان میں حاصل ہوئی ہے ہم لوگوں نے اس لیے یہ خیال کیا کہ جب تک ہم کو کوئی ایسا موقع نہ دیا جائے جیسا کہ یہ ہے اُس وقت تک کسی قوم کے لیے جس کے حالات ہمارے جیسے ہوں یہ بات ناممکن ہے کہ اس قسم کے الزامات کی تردید با اثر مستند اور کافی طریقے پر کر سکے...... ہم اس موقع پر پورے زور کے ساتھ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہندستان کے مسلمان اپنے اس اصول کو آج بھی اتنا عزیز رکھتے ہیں جتنا کہ گزشتہ زمانے میں رکھتے تھے۔"

ہم کو یقین ہو کہ حضور ہمارے اس یقین دلانے کو تسلیم کریں گے کہ ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے کہ رعایا اور گورنمنٹ کے درمیان پورا اعتماد اور ہندستان کی مختلف جماعتوں میں باہم گہرے دوستانہ تعلقات ہونے چاہئیں لیکن ہم کو اس بات سے سخت رنج معلوم ہوتا ہو کہ ان کوششوں کو جو ہندستان کی دو بڑی ہمسایہ قوموں کے تعلقات کو زیادہ دوستانہ اور ہموار بنانے کے لیے کی جارہی ہیں بعض حلقوں میں بُرے معنے پہنائے جارہے ہیں۔"

مقتضیاتِ وقت کے لحاظ سے اس ایڈرس میں کوئی بات ایسی نہیں جس پر خوردہ گیری کی جاسکے مگر مصنّف حیاتِ شبلی کو تو اعتراض ہی سے غرض ہو ایسے نہیں بلکہ ان سے بہت کم خطرناک حالات میں ارکانِ ندوہ نے بھی تو ایسے ہی ایڈریس پیش کیے تھے۔

اب ہم مولانا کو عملی و میدانی سیاست میں دیکھتے ہیں، ان کا سب سے پہلا مضمون بین اسلامی سیاست میں "خلافت" ہو اس کی نسبت مصنّف حیاتِ شبلی نے لکھا ہو کہ (۱) آورد تھی آمد نہ تھی (۲) لکھوایا گیا لکھا نہیں گیا"۔ سیاست میں اور خصوصاً جب مذہب کی بھی آمیزش ہو اس طرح ضمیر فروشی وہی شخص کرسکتا ہو جس میں اخلاقی جرأت کا فقدان ہو حالاں کہ سیاست کی بُنیاد صرف اخلاقی جرأت کے سطح پر قائم ہوتی ہو۔

اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں دوسرا مضمون ہو" مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے" جس کی نسبت خود مصنّف کا ریمارک ہو کہ یہ مضمون لکھ کر گویا مولانا نے گورنمنٹ کو اس کے اُس چھ ہزار سالانہ کی قیمت ادا کی جو اُس نے دارالعلوم کو دینا منظور کی تھی" یہ ضمیر فروشی کی بدترین مثال ہو کہ

احکامِ شرعی میں قیمت ادا کرنے کے لیے کوئی تدلیس کی جائے۔
مولانا نے ہنگامہ کان پور وغیرہ کے متعلق جو تند و تیز اور پرجوش و انقلاب آفریں نظمیں لکھیں اُن کی داستانِ عبرت بھی حیاتِ شبلی کے ہی اوراق میں یہ ہی کہ
"جنوری ۱۹۱۳ء میں کوئی سرکاری پارٹی تھی جس میں مولانا بھی شریک تھے اس میں لفٹنٹ گورنر صاحب سے جب سامنا ہوا تو انھوں نے شکایت آمیز بلکہ کچھ طعن آمیز فقرے کہے چیف سکریٹری بھی سرگرداں رہے اور دوستانہ شکایت کی، مولانا نے کہا کہ یہ اتفاقی حالات ہیں ورنہ میں نے تو ہمیشہ قوموں میں بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہی...... اس واقعے کی مزید تفصیل مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے ایک بیان سے معلوم ہوتی ہی جو انھوں نے مکاتیبِ شبلی میں مولانا کے ایک رقعہ کی تشریح میں حاشیے کے طور پر لکھا ہی، جس سے معلوم ہوتا ہی کہ حاذق الملک حکیم اجمل خاں مرحوم جو ان دِنوں نہایت حکّام رس تھے اور ریاستِ رامپور سے تعلقات کی بنا پر مسٹر برن سے اُن کے خاص مراسم تھے لکھنؤ آئے تو یکم فروری ۱۹۱۳ء کو مولانا کو ساتھ لے کر مسٹر برن سے ملنے گئے مگر مولانا کی طرف سے اُن کی پیشانی پر بل بہ دستور رہے وہاں سے آکر رات ہی کو مولانا نے ایک رقعہ لکھ کر مولوی عبدالماجد صاحب کو بُلوایا جو ان دنوں سیرت کے انگریزی تراجم کے سلسلے میں مولانا کے انگریزی کاروبار کو انجام دیا کرتے تھے، مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ یہ تحریر بالاستب کو ملی میں اسی وقت گیا مولانا بہت دیر تک تخلیہ میں گفتگو کرتے رہے ماحصّل یہ تھا کہ گورنمنٹ آج کل مجھ سے بدظن ہی خصوصاً معاملۂ کان پور کے متعلق میری نظموں سے، حاذق الملک حکیم اجمل خاں مجھے آج مسٹر

بدن چیف سکریٹری کے پاس لے گئے تھے وہ بہت کبیدہ تھے حالاں کہ
اس سے پیش تر بہت اخلاق و تپاک سے ملتے تھے تم ان کے نام ایک
مفصل چٹھی اس مضمون کی میری طرف سے لکھ دو کہ میں مُدّت العمر کبھی
انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں میری ہمیشہ یہ کوشش رہی
کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف
سے جو غلط فہمیاں مدتِ دراز سے چلی آتی ہیں وہ دور ہوں چنانچہ اس
پر میری تصانیف شاہد ہیں اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں میں نے
الندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے سے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں
پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً فرض ہے اور اسی سال
ندوہ کے سالانہ جلسے میں وفاداری کا ایک رزولیوشن بھی پاس کرایا۔
پھر معاملۂ عبدالکریم میں مجھے محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے
مطابق ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت ہند کی اخبارات میں گالیاں
سننا پڑیں رہا واقعۂ کان پور کے متعلق نظمیں تو وہ ایک ہنگامی جوش
کا نتیجہ تھیں جس میں سارے ہندستان کے مسلمانوں کے ساتھ میں بھی
شریک تھا" (۶۴۳)

اس معذرت کی تاویل بھی جو مصنف نے کی ہے ملاحظہ ہو: "ہم کو یہ
معلوم نہیں کہ یہ خط بھیجا گیا یا نہیں اور اگر بھیجا گیا تو اس کا کیا اثر ہوا لیکن یہ معلوم
ہے کہ مولانا کی اس ساری مدافعانہ کوشش کی غرض یہ تھی کہ ندوہ سے گورنمنٹ
کے تعلقات جو اس کد و کاوش اور جد و جہد کے بعد درست ہوئے تھے وہ ان
کی بدولت پھر نہ بگڑ جائیں" (۶۴۴)

مگر مصنف یہ بھول گئے کہ مولانا تو جولائی ۱۹۱۳ء میں مستعفی ہو چکے تھے

اور اُن سے طلبا کو درسِ بخاری تک ممنوع کر دیا گیا تھا اور جس تاریخ یکم فروری ۱۹۱۴ء کو یہ مسودہ تحریر ہوا ارکانِ ندوہ کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی شروع ہوچکی تھی ایسی صورت میں ندوہ پہ کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا اور نہ ان نظموں سے ندوہ کا کوئی تعلق تھا، اس قسم کی عاجزانہ معذرت اور ایک ایسے مضمون کو جو (بقول مصنّف) موقع کی مناسبت سے جہاد کے فضائل ومناقب پر تھا باغیانہ قرار دینا بزدلانہ خوف ودہشت کے سوا اور کسی بات پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد بھی لکھتے ہیں کہ" اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا کی "سیاسی خوئے بد" میں بقول سعدیؒ اب بھی کوئی تغیر نہیں ہوا چنانچہ اس کے بعد ہی اگست ۱۹۱۴ء میں جب بڑی لڑائی چھڑی تو گو وہ اس وقت اپنے بھائی کی ناگہانی وفات کے سبب سے نہایت نڈھال تھے تاہم اس ناتوانی میں بھی ان کی کمان سے یہ تیر نکل ہی گیا جس میں انھوں نے غالب کے اس شعر کی ؂

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا ۔۔۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تضمین کی تھی ۔۔۔۔۔۔ یہ تیر پورے نشانے پر بیٹھا مولوی اقبال احمد صاحب کی روایت ہے کہ اس نظم پر حکومت نے اُن کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن مولانا خود مرض الموت میں گرفتار تھے اتفاق سے ایک نیک دل مسلمان پولس افسر اس زمانے میں یہاں متعیّن تھے جو مولانا کے پورے قدر شناس تھے وہ ان کی اس بیماری کے عذر پہ اس کو ٹالتے رہے یہاں تک کہ شاعر چند روز کے بعد خود قیدِ عنصری سے آزاد ہوگیا (۶۲۵)

لیکن اگست میں جب بڑی لڑائی چھڑی تو مولانا اچھے خاصے تھے دارالمصنّفین کا انتظام کر رہے تھے کلیاتِ شبلی میں خود مصنّف نے اس نظم کو اگست میں لکھا جانا بیان کیا ہے اور یومِ انتقال سے دس بارہ دن پہلے اعظم گڑھ سے اپنے وطن قصبہ

بنڈول عید الضحیٰ (اوائل نومبر) کے موقع پر گئے، البتہ عید کے دوسرے دن الیس آکر بیمار ہوئے ۷، نومبر سے شدت مرض ہوئی اور ۸، نومبر کو رحلت کی (ملخص ۲۱ ۷ - ۲۲ ۷ حیات) یہ تیر جو نشانے پر بیٹھا کہاں چھوڑا گیا یعنی نظم کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوئی یا علیحدہ چھپوا کر تقسیم کرائی گئی یا کسی جلسے میں مولانا نے سنائی، اور جب تک ان تینوں میں کوئی بات نہ ہو حکومت کو ایسے احکام کا موقع نہیں ملتا، طبع و اشاعت کی صورت میں مالک پریس اور پبلشر سے پہلی باز پرس ہوتی ہے اور اسی کی دار و گیر کی جاتی ہے لیکن یہاں اس کا کوئی ذکر نہیں نہ کسی جلسے کے انعقاد کا حوالہ ہے۔ پولس افسر کے علاوہ ایسی گرفتاریوں کا تعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے بھی ہوتا ہے اور ایسے وارنٹوں کی خصوصاً زمانۂ جنگ میں فوری تعمیل کی جاتی ہے کتنا ہی قدر شناس افسر ہو بغیر اجازت تین مہینے تک اس کا ٹالنا محالات سے ہے، اس تمام تنقید سے یہ روایت ایک گپ سے زیادہ وقیع نہیں ہوسکتی جو محض مولانا کی سیاسی اہمیت کے لیے تراشی گئی مولانا نے یہ نظم ضرور لکھی تھی اور راقم تبصرہ جب ان کی رحلت کے بعد ہی اعظم گڑھ گیا تھا تو ان کے قلم کی لکھی ہوئی دیکھی تھی مگر اس پر ان کا نام نہ تھا بلکہ کسی اور کا تخلص لکھا ہوا تھا۔

مولانا کے اخلاق و عادات

کا تذکرہ ۱۰۸ صفحات (۷۲۶ تا ۸۳۴) میں کیا گیا ہے۔ معاصرین، احباب اور والیانِ ملک سے نام بہ نام تعلقات کا بھی بہ اجمال اور بہ تفصیل بیان ہے سرسید کا بھی جا بہ جا ضمناً ذکر ہے مگر تنقیص و تنافر کے ساتھ، چناں چہ مولانا کے مذہب کے عنوان میں لکھتے ہیں کہ "خود سرسید کی اس شکایت پر کہ طلبا نماز میں کیوں شریک نہیں ہوتے یہ صاف کہہ دیا کہ چوں کہ آپ شریک نہیں ہوتے (سرسید سلسل البول

کی شکایت کے سبب سے گھر جا کر نماز پڑھتے تھے اور جمع بین الصلوٰتین بھی کرتے تھے" (۱۷۸ حیات) حالانکہ مولانا کے مذہب کو اس قصے[۱] سے دُور کا بھی تعلق نہیں اور اور پھر (صفحہ ۱۵۰ حیات) میں مولانا کے خط کا یہ فقرہ لکھ چکے ہیں" مغرب کی نماز سبحان اللہ کیا شان و شوکت سے ہوتی ہی کہ بس دل پھٹا پڑتا ہی خود سیّد صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں آمین زور سے کہتے ہیں ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہی" مگر مولانا کی پابندی صوم و صلوٰۃ کی جو حالت تھی اس پر پوری روشنی نہیں ڈالی، لیکن اتنا بوثوق اور عینی شہادت سے کہا جا سکتا ہی کہ جس جمع بین الصلوٰتین پر تعریض ہی مولانا بمبئی کے قیام میں اکثر خود وہی جمع بین الصلوٰتین کیا کرتے تھے، کیوں کہ چوپاٹی اور اپالو حسن مناظر اور خوبانِ زردشتی کے جمال سے لطف اندوزی کا وقت ہی مغرب کا ہوتا ہی۔

مصنّف نے یہ واقعہ بھی بیان نہیں کیا کہ مولانا نے آخر زمانے میں کسی طبیب کے مشورے سے افیون بھی شروع کر دی تھی (رو۔ حمید)

مصنف نے مولانا شروانی کے مضمون کا یہ اقتباس درج کیا ہی کہ "عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے مخالفین کی مخالفت سے رُو برو نہیں رکتے تھے مگر ان کے پسِ پشت بیانِ اختلاف میں بھی ان کی زبان

---

[۱] اسی واقعے کو بہ تبدیل الفاظ سر سیّد سے کش مکش اور اختلاف کے باب میں بھی لکھا ہی" ایک دفعہ سر سیّد نے مولانا سے پوچھا کہ ہمارے کالج میں ان تاکیدوں کے باوجود لڑکے نماز کے پابند کیوں نہیں ہوتے فرمایا کہ اس لیے کہ وہ آپ کو پڑھتے نہیں دیکھتے آپ شام کو کالج کی تعمیرات دیکھنے مسجد کے سامنے آتے ہیں مغرب کی اذان اور نماز ہو جاتی ہی اور آپ شریک نہیں ہوتے وہ سمجھتے ہیں کہ آپ نماز نہیں پڑھتے انھیں کیا معلوم کہ آپ کو سلسل البول کی وجہ سے کپڑے اتارنے پڑتے ہیں اور آپ دو نمازیں ملا کر جمع بین الصلوٰتین پڑھتے ہیں" (۲۸۸ حیات)

سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے مخالف کی رائے کی تردید سختی سے کرتے تھے اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کرکے اس کو ذلیل و رُسوا کرتے" (۷۶۲ حیات)

اب اس بیان کو محک تنقید پر لائیے۔ مولانا کی زندگی کے کئی اہم سال وہ ہیں جو ندوہ میں گزرے اور یہاں ان کو مخالفین اور حاسدین سے آخر زمانے میں سابقہ پڑا اور اس اخلاق کے امتحان کا موقع آیا۔ مگر دیکھیے کہ ایک مخالف (معاصر عالم) اور دوسرے معاصرین کی نسبت (جن میں علما اور ذی رُتبہ لوگ بھی تھے) اپنے خطوط میں جو تلامذہ رُاشدین کے نام ہیں پیرِ بے مغز، سازشی، اشرار، منافقین، ننگانِ بازاری، پاجی، خبیث کے الفاظ تک لکھ دیے ہیں، کیا یہ نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی نہیں ہو اور کیا کسی کو ذلیل و رُسوا کرنے کے لیے ان الفاظ سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں افسوس ہو ان کے جانشین نے جو حیاتِ شبلی کے مصنّف ہیں ایسے خطوط شائع کرکے اخلاقی و قانونی جرم کے ارتکاب تک میں باک نہیں کیا حالاں کہ ان الفاظ کی جگہ نقطے دیے جا سکتے تھے، جس طرح کہ بعض اور خطوط میں دیے گئے ہیں ممکن ہو کہ مولانا کی ہدایت ہی ایسی ہو کیوں کہ مولانا نے خود اُن خطوط کا انتخاب کیا تھا جن کا مجموعہ شائع ہونے والا تھا، جیسا کہ مولوی عبدالسمیع کے موسومہ خط (سمیع ۵۷ع) سے اندازہ ہوتا ہے، اسی طرح جب مولوی وحیدالدین سلیم محض ہنگامہ کانپور پر پُرجوش مضامین لکھنے کی پاداش میں مسلم گزٹ کی اڈیٹری سے علٰحدہ ہونے اور پھر حکماً لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور کیے جاتے ہیں تو چوں کہ انھوں نے مولانا پر بھی معاملات ندوہ کے متعلق سخت نکتہ چینی کی تھی مولانا اپنے اطمینان اور مسرّت کا یوں اظہار کرتے" ہاں

وحیدالدین لکھنؤ سے تشریف لے گئے اودھ اس کثافت سے صاف ہو گیا اخبارات میں بھی یہ ذکر آ گیا ہے حقیقت میں اودھ نجاستوں میں آلودہ ہو رہا تھا حریت و آزادی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں لیکن سفاہت اور حریت مختلف چیزیں ہیں" (۹۴ سید سلیمان) اور جب مولوی ابوالکلام کا آتش ریز قلم معاصر علما اور ارکان ندوہ پر انگارے برساتا ہے تو مولانا خاموش رہتے ہیں۔

علی گڑھ والوں نے ہمیشہ مولانا کا احترام کیا ندوہ کی حمایت کی لیکن جب ندوہ کے معاملے میں اختلاف کی نوبت آئی اور اخبار البشیر میں چند مخالفانہ مضامین شائع ہوئے تو مصنف حیات کو ہی لکھا کہ" وقت ایسا ہے کہ علی گڑھ والے جو ندوہ کے ابتدائی دشمن تھے البشیر وغیرہ اب ندوہ کی حمایت کے پردے میں اصلاح کے دشمن بن گئے ہیں اور میرے انتقام کے لیے ہر قسم کے بہتان و افترا سے کام لے رہے ہیں" (۷۷ سلیمان) اسی جذبے سے انھوں نے چند طنزیہ نظمیں بھی لکھیں جو ان کے کلیات اور حیات میں شامل ہیں، مسلم لیگ پر بھی جو طعن آمیز نظمیں ہیں وہ یہ سب مہاراجہ محمود آباد اور بعض ارکان لیگ سے ذاتی مخالفت کے نتائج ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولانا میں جسارت کا فقدان تھا اور اپنے حریف کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے وہ کتراتے تھے۔ ندوہ کے تنازعات ہیں۔ دوسروں کو پروپگنڈا کی تدابیر بتاتے رہے اپنے خاص رفقا کو ہدایات دیتے رہے لیکن خود مرد میدان بننے کی جرأت کبھی نہیں کی[۱]۔

سید افتخار عالم مارہروی مرحوم مولانا کے عقیدت مندوں میں تھے اور مولانا کی لائف لکھنا چاہتے تھے ان کی اس خواہش کے متعلق مولوی ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں کہ" ہاں اور سنئی، افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر

---

[۱] مصنف حیات شبلی اور دیگر تلامذہ کے نام کے خطوط قابل مطالعہ ہیں۔

ان ہی آلودہ ہاتھوں سے حیاتِ شبلی کو چھونا چاہتے ہیں اجازت اور حالات مانگتے ہیں" (صفحہ ۴) اس مختصر خط میں افتخار عالم سے زیادہ سنگین حملہ مولوی نذیر احمد پر ہے۔ حالاں کہ اسی کتاب پر جو ریویو ہے اس میں لکھتے ہیں کہ

"مولانا نذیر احمد مرحوم اس پائے کے شخص تھے کہ اگر یورپ میں پیدا ہوتے تو اُن کی بیسیوں سوانح عمریاں لکھی جاتیں ملک اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا اور مسرت کی بات ہے کہ یہ ضرورت بوجہ احسن پوری ہوئی ...... بہرحال ہم مصنف کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ایک فاضل کی قدر دانی کا پورا حق ادا کیا اور وہ خدمت انجام دی جو زبانِ اُردو کی طرف سے ایک فرض واجب الادا تھا" (حیات النذیر صفحہ ۱۲ و ۱۳) مولانا حالی کے متعلق مصنف حیاتِ شبلی نے جابجا تعلقاتِ احترام و اعتراف دکھائے ہیں اور حیاتِ جاوید پر مولانا کے ریمارکس کو ذاتیات سے الگ رکھا ہے مگر جب ہم ایک پرائیوٹ خط میں یہ فقرہ پڑھتے ہیں کہ "حیات جاوید کی نسبت رائے پوچھتے ہو میں کچھ کہنا نہیں چاہتا تم مقلد نہیں مجتہد ہو پھر تقلید کیوں کرو اور وہ بھی چھوٹی امت کی" (۱۹۰۹ء مسیح حصہ اول) تو مولانا کے اخلاق پر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

مصنف حیاتِ شبلی نے سرکاری اعزازات کے متعلق لکھا ہے کہ "انگریزی گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب دیا اور مختلف علمی و تعلیمی کمیٹیوں میں ان کو ممبر بنایا دربار میں بھی بحیثیت شمس العلما اُن کی کرسی تھی، دربار تاج پوشی کے موقع پر بھی وہ شریک دربار ہوئے تھے اور شاہ ایڈورڈ نے ان کو ہاتھ بڑھایا تھا" (۴۸۱) علی گڑھ کے زمانے میں مولانا کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے یونی ورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے تھے پھر ۱۹۰۸ء کے بعد جب کہ چھ ہزار سالانہ امداد ندوہ، کی قیمت ایک مضمون سے ادا کر چکے تھے تو علمی و تعلیمی کمیٹیوں میں ممبر بنائے گئے، درباروں میں کرسی

کی بشارت تو خلعتِ خطاب کے وقت ہی مل چکی تھی اور یہ کوئی امتیازی چیز نہ تھی البتہ بادشاہ کا ہار بخشنا ضرور ایک امتیاز ہی، یہ ہار بخشی بھی ایک تاریخی واقعہ ہی پہلے تو نام کی تصحیح کر لی جائے، شاہ ایڈورڈ نہیں بلکہ شاہ (ملک معظم) جارج پنجم (قیصرِ ہند) تھے، دربار دہلی کے پروگرام میں "درشن" بھی تھا یعنی ملکِ معظم اور ملکۂ معظمہ لال قلعہ کے درشن جھروکہ میں رونق افروز ہوے اور مذہبی رہنما (جن میں مسلمان، ہندو، سکھ تھے) آداب بجالاتے ہوئے سامنے سے گزرے مولانا بھی ان ہی میں تھے، یہ ہی وہ ہار جو مولانا کو بخشا گیا تھا۔

مصنف نے کتاب کے دوسرے ہی صفحے پر سوانح کے ماخذوں کے بیان میں لکھا ہی کہ "ان کی پوری زندگی کا خاکہ اُن کے مکاتیب کے مرقع میں بہ آسانی مل گیا" ...... اللہ تعالیٰ نے ان مکاتیب کی تالیف واشاعت کے ذریعے درحقیقت صاحبِ مکاتیب کے سوانح زندگی کے ذخیرے کو میرے ہاتھوں بلا قصد وارادہ پہلے ہی محفوظ کرا دیا تھا...... اس نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ "حیاتِ شبلی" درحقیقت مولانا شبلی کی خود نوشت سوانح عمری ہی"

لیکن کس قدر حیرت کی بات ہی اور کس درجہ اخفائے حالات و واقعات کی بدترین مثال ہی کہ مولانا کی زندگی کا خاکہ کھینچنے میں ایک دوسرے مرقع "خطوطِ شبلی" کو قصداً نظر انداز کر دیا گیا۔ ان خطوط میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں جو اُن کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے اور نہ شاید کبھی گفتگو میں اُن کا ذکر انھوں نے فرمایا، مولانا نے ان خطوط میں تعلیمِ نسواں پر (جو وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہی) بحث کی ہی، وہ عورتوں میں علمی مذاق کے متمنی تھے اور چاہتے تھے کہ عورتیں علمی کام کریں اور اس کے متعلق کس کس طرح ترغیب دیتے اور شوق پیدا کرتے تھے عورتوں کے حسن و جمال پر اپنی رائے ظاہر کی ہی، ان میں موسیقی کے متعلق جو کچھ لکھا ہی اُسے

اندازہ ہوجاتا ہو کہ مولانا کو خود اس سے کتنا لگاؤ تھا اور وہ اس کے ابتدائی اصول اور قواعد اور راگوں سے واقف تھے، مصوری اور نقاشی میں بھی صاحبِ نظر تھے، مولانا پردے کے حامی تھے لیکن بے پردگی کو چنداں معیوب بھی نہیں سمجھتے تھے، وہ عورتوں کی تعلیمی و معاشری اصلاح و ترقی کے لیے مخصوص زنانہ رسائل و اخبار کی ضرورت محسوس کرتے تھے، باتوں باتوں میں اور لطیف جملوں میں بان کی اصلاح کردیتے اور ادبی نکات سمجھا دیتے تھے مولانا خود ایک اسپیکر تھے اور آنکھ کھول کر انھوں نے اپنی قوم میں جو بڑے اسپیکر دیکھے وہ سب مرد تھے مگر ان کو بعض جلسوں میں جب غیر مسلم عورتیں بھی اسپیکر نظر آئیں اور انھوں نے اُن کی قوتِ تقریر کا مشاہدہ کیا تو اُن کی آنکھوں کے سامنے تاریخ اسلام کا وہ مرقع آگیا جس میں عورتوں کا کمالِ خطابت ہی اور حسرت پیدا ہوئی اور جب یہ جوہر عطیہ بیگم میں نظر آیا تو بے اختیار دل چاہا کہ عورتیں اس میں کمال پیدا کریں اور ذہن میں ایک اسکیم آگئی گویا یہ ایک تمنّا تھی کہ مسلمان عورتیں بھی اسپیکر ہوں وہ حُسن و قبحِ خطابت کے بھی نقّاد تھے "اُردو تقریر میں اصل مضمون کی خوبی سے زیادہ طرزِ ادا کی خوبی کا لحاظ ہونا چاہیے بمبئی کے جلسے میں مسز نائیڈو اگرچہ نہایت عمدہ بولیں ڈلیوری بھی اچھی تھی لیکن تصویر کی طرح غیر متحرک رہیں تقریر میں تمام اعضا کو زبان کا ساتھ دینا چاہیئے" (خط ۶)

ان خطوں میں سب سے زیادہ دل چسپ وہ تنقید ہی جو اپنے یا اپنے کلام کے متعلق نہایت بے تکلفی اور سچائی سے کر جاتے ہیں یہ بات کہاں نصیب ہوتی ہی کہ خود مصنّف اپنی زبان یا قلم سے اپنے کلام کے متعلق رائے لکھے"

اس باب میں چند احباب خاص کا نام بہ نام تذکرہ ہی لیکن زہرہ بیگم اور عطیہ بیگم اس زمرے اور تذکرے سے محروم ہیں کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں۔ حالانکہ

ان دونوں کے ساتھ مولانا کے تعلقات محبت و وداد ان لوگوں سے جن کا ذکر کیا گیا ہے کچھ کم نہیں بلکہ بہت سوں سے زیادہ تھے اور اس کا اندازہ نہ صرف خطوں کے مضمون سے بلکہ ان کی تعداد سے بھی ہوتا ہے، مخصوص احباب میں مولانا شیروانی (نواب صدر یار جنگ) ہیں ان سے سلسلۂ مراسلت ۱۸۹۹ء تا ۱۹۱۴ء جاری رہا ہے اس عرصے میں (۱۱۸) خطوط ہیں۔ ۱۶۱ میں مولوی حمیدالدین سے خاص محبت و الفت ہے ۳۰ رجون ۱۸۹۵ء سے اکتوبر ۱۹۱۴ء تک ۲۰ سال میں (۷۷) کی تعداد ہے تلامذہ میں خاص درجہ خود مصنف کا ہے اور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۴ء (۸۲) ہیں مگر عطیہ بیگم کے نام تین سال تین ماہ (۱۷ر فروری ۱۹۰۸ء تا مئی ۱۹۱۱ء) میں ۵۵ کی ہے اور زہرہ بیگم کے نام ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۴ء ( ) کی تعداد ہے جو اوسطاً اور نسبتاً سب سے زیادہ ہے پھر ان خطوں میں جو پیار اور محبت پائی جاتی ہے بہت کم دوسرے خطوط میں ملتی ہے، کیا مصنف نے ان کا تذکرہ مولانا کی شان تقدس کے خلاف سمجھا؟ (حالاں کہ خود لکھتے ہیں کہ " پھر اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی تورع و تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا (۱۲۸ حیات) کیا ایک مرد کی بائیوگرفی میں عورتوں کا ذکر اخلاقی بدنمائی تھی، اس کے متعلق مولانا کا ہی نقطۂ نظر یہ ہے کہ " عورت کا حال مردوں کے ساتھ کسی پرچے میں دیکھ کر ہم کیوں گھبرائیں گے خود قرآن مجید میں ایک سورۃ کا نام نسار ہے یعنی عورت، عربی بیاگرفیوں میں عموماً مردوں کے ساتھ عالمہ عورتوں کا حال تفصیل سے ہوتا ہے" (مکاتیب خطوط شبلی) ان کا ذکر تو مکاتیب شبلی میں بھی ہے جو گویا خود نوشت داستانِ زندگی ہے۔

مصنف حیاتِ شبلی نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق (معتمد انجمن ترقی اردو کل ہند) پر بھی فرد جرم لگائی ہے، ایک جگہ جہاں کالج میں طلبا کی زندگی میں علمی رنگ نمایاں ہونے کا ذکر ہے چند نام گنا کر لکھتے ہیں کہ " مولوی عبدالحق صاحب ناظم

انجمن ترقیٔ اُردوٗ (بہ شرطے کہ وہ مانیں) اسی آب و ہوا کی پیداوار ہیں (۱۵۱) کتاب امہات الامّہ جلائے جانے کے سلسلہ بیان میں دوسری جگہ تحریر ہو کہ" اس واقعہ کو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری ترقیٔ اُردوٗ نے اپنے مقدمے حیات النذیر میں مولانا شبلی کی طرف بہ واسطہ یا بلاواسطہ بے وجہ اور بلا تحقیق منسوب کرکے ایک تاریخی جرم کیا ہو حالاں کہ مولانا اس مجمع میں سرے سے موجود ہی نہ تھے مولانا شروانی صاحب نے جو شریکِ جلسہ تھے مقدمہ مقدماتِ عبدالحق (ص۸) میں اس واقعے کی پوری کیفیت لکھدی ہو جس سے معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب مولانا شبلی مرحوم کی طرف بے بنیاد واقعات کی نسبت میں کتنی بے احتیاطی برتتے ہیں" (۴۹۶) مولانا کے اخلاق و عادات کے سلسلے میں تیسری جگہ ارشاد ہو کہ" ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (ترقیٔ اُردوٗ) نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے گویا اپنا یہ مسلک ہی مقرر کیا تھا کہ جا و بے جا اُن پر اعتراض کریں مگر کبھی انھوں نے اس کے سوا کہ" یہ الزام صحیح نہیں" اُن سے کچھ اور نہیں کہا (ہمارے معاصرین مولفہ مولوی عبدالحق صاحب سوانح مولوی سیّد علی بلگرامی) - (۷۵۶)

مگر اب پردہ اٹھا کر دیکھیے کہ (۱) کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۴۳ء کے خطبۂ صدارت شعبۂ اُردوٗ میں مولوی عبدالحق صاحب علی گڑھ میں علمی ماحول پیدا کرنے کے بیان میں کہتے ہیں کہ" اس کے علاوہ بعض پروفیسر مثلاً پروفیسر آرنلڈ مولانا شبلی، مولوی کرامت حسین اس پائے کے تھے کہ ان کی تعلیم گفتگو اور صحبت صحیح علمی اور ادبی ذوق کی ضامن تھی........ شبلی، آرنلڈ، حالی، سرسید، کرامت حسین کچھ اُٹھا کے نہیں دیدیتے تھے یا کچھ گھول کے نہیں پلا دیتے تھے ان کی زندگی اُن کے انہماک اور ان کی صداقت کا اثر نامعلوم طور پر خود بہ خود نوجوانوں کی زندگی پر پڑتا تھا" یہ خطبہ مصنّف کی نظر سے بھی گزرا ہو اور معارف ستمبر ۱۹۴۳ء میں

اس پر مختصر ریویو بھی ہے اب تاریخی جرم کی روئداد مصنّف حیات النذیر، مولوی عبدالحق اور مولانا شیروانی کی زبان سے ہی سنیے لیکن پہلے مولانا نذیر احمد مصنف امہات الامہ کے متعلق مولانا شبلی کے جو جذبات تھے ان کو ملحوظ رکھیے" مولانا نذیر احمد اور مولانا میں اگرچہ وہ ربط و اخلاص نہ تھا جو مولانا کو مولانا حالی کے ساتھ اور مولانا حالی کو مولانا کے ساتھ، تاہم بالکل بے تعلقی بھی نہ تھی .... مولانا نے دسمبر ۱۸۹۵ء کی کانفرنس میں جو قصیدہ پڑھا تھا اس میں ان دونوں بزرگوں کے نام بڑی عزت سے لیے ہیں ؎ نگہ از ہر سوئے حالی آزادہ فگن + وان نذیر احمد طوطی شکرخا بنگر (۸۰۸ حیات شبلی) مگر اکتوبر ۱۸۹۲ء میں اس طوطی شکرخا کے متعلق مولانا ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں" کانفرنس اب کی غالباً پھیکی ہو گی مولوی حشمت اللہ و مرزا حیرت کی بڑ بہت سن چکے مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہے مولوی نذیر احمد بھی غالباً چپ ہیں اور بولیں بھی تو اُن کا طرز اجیرن ہو چکا" (بنام محمد اسحاق ؏ مکاتیب حصہ اوّل)۔

۱۹۰۹ء میں مؤلف حیات النذیر نے مولانا شبلی سے خواہش کی تھی کہ وہ ان کی لائف لکھنا چاہتے ہیں اجازت و حالات عطا کریں، اس کے متعلق مولانا نے ابوالکلام آزاد کو لکھا کہ" ہاں اور سنی افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر انھیں آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں اجازت اور حالات مانگے ہیں میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوا لیجیے بھئی بتا تو نہ دو گے ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی ہو گی" (مکاتیب ؏)

حیات النذیر کے مصنف نے اشاعت سے قبل مطبوعہ لائف چند اصحاب کے پاس تبصرے کے لیے بھیجی تھی جن میں مولانا شبلی بھی تھے، اصل واقعہ کی

نسبت اس کتاب میں تحریر ہو کہ" شمس العلما علامۂ شبلی فرماتے تھے کہ امہات الامہ کی تصنیف کے بعد جب ندوہ کا جلسہ دہلی میں ہونے والا تھا تو میں نے جلسہ کا اشتہار دیتے ہوئے ہندستان کے نامور علما کی فہرست بھی شرکت جلسہ کے لیے چھاپی تھی اس میں مولوی نذیر احمد کا نام بھی تھا وہ اشتہار کہیں مولوی نذیر احمد صاحب کے پرانے حریف کے نظر پڑ گیا تو انھوں نے مجھے بھی صرف اس بنیاد پر کافر قرار دے کر فتویٰ چھپوا دیا کہ نذیر احمد کے نام کے ساتھ میں نے مولوی کیوں لکھا اور اُن کو زمرۂ علما میں کیوں شمار کیا، علامۂ موصوف یہ بھی فرماتے تھے کہ کتاب قابلِ سوختنی تھی اور میں نے بھی جلا دینے کی رائے دی تھی اگرچہ اس میں آگ لگانے والے جلسے میں شریک نہیں ہوا" (صفحہ ۴۲۸ حیات النذیر)

جن اصحاب کے پاس یہ کتاب بھیجی گئی ان میں سے مولانا حالی اور مولانا شبلی نے تبصرہ اور مولوی عبدالحق نے مقدمہ لکھا، اس مقدمے میں وہ لکھتے ہیں کہ "طالب علمی کے زمانے میں جب میں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یوربین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلما مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر محکم دلائل اور پُر زور شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر پوری تسکین ہو گئی اور یہ یقین ہو گیا کہ یہ محض فسانہ اور یوربین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہو مگر جب مجھے اس واقعہ کی خبر لگی اور خصوصاً جب میں نے یہ سنا کہ علامہ موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کارِ خیر میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا اور اب تک میرا خیال ہو کہ کچھ تعجب نہیں جو مسلمانوں نے کتب خانۂ اسکندریہ جلا دیا ہو"

مولانا شبلی نے تبصرہ لکھا جو اگرچہ مختصر ہی مگر جامع اور نقادانہ ہو صاحب سوانح

کے تبحر علمی اور فارسی نویسی پر بھی تعریف ہو لیکن مصنف نے امہات الامہ کے متعلق اپنی ملاقات میں جو رائے مولانا سے منسوب کی ہو اس سے برات و انکار نہیں اور نہ کتاب کی اشاعت کے بعد جس میں یہ مقدمہ (مع دیگر تبصروں کے) شامل ہو پبلک یا پرائیویٹ طور پر تردید کی ،

اب ۱۲ سال بعد (اکتوبر ۱۹۳۱ء میں) مولوی عبدالحق کے مقدمات پر نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی نے جو کچھ لکھا اور جس کے استثنا کو مصنف نے مقدمہ نگار کو مجرم قرار دیا ہو اس کو بھی پڑھیے (حیاتِ شبلی میں صرف حوالے پر ٹال دیا ہو)

"حیات النذیر کے مقدمے کے متعلق ایک واقعے کا اظہار ضروری ہو ، مولوی نذیر احمد خاں صاحب مرحوم کے رسالہ امہات الامہ جلائے جانے کے واقعے کو مولوی صاحب (یعنی مولوی عبدالحق نے بڑی دل سوزی سے بیان کیا ہو ، ایسا کہ دل سوزی نے اس میں کباب کا چٹ پٹا پن پیدا کر دیا ہو' واجب الاظہار واقعہ یہ ہو کہ ندوۃ العلما کے ارکان و شرکا اس کے جلانے پر آخر تک آمادہ نہ تھے خود مولوی صاحب مرحوم کی تحریک تھی۔ اس طرف کے تامل نے تحریک کو اصرار سے بدل دیا اصرار نے شدت اختیار کی بلکہ دھمکی کی صورت جیسی کہ مولوی صاحب مرحوم کی طرف سے ایسے موقع پر ہوا کرتی تھی۔ مسیح الملک مرحوم نے (جو واسطہ تھے) بالآخر کہا کہ میں نے شیر[1] کو کٹھرے میں بند کر دیا ہو آپ نکالتے ہیں اس پر جلسہ کر کے غور کیا گیا اور مؤلف مرحوم کی رائے کی تائید ہوئی چنانچہ رسالے جلائے گئے مٹی کا تیل لا کر دو بجے رات کو جس نے رسالوں پر ڈالا تھا وہ میں ہی تھا اتفاق یہ کہ جلانے کے بعد آندھی نے خاکستر اڑا دی

[1] شیر سے مولانا نذیر احمد سے مراد ہو۔

بارش نے جگہ صاف کر دی اسی طرح "پلاس" سونگھنے کا موقع کسی کو نہ مل سکا۔"

اس پورے بیان میں نہ تو جلانے کے واقعے سے انکار ہی نہ مولانا شبلی کی برأت ہی نہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کی تردید ہی بلکہ واقعہ واجب الاظہار کی صورت بیان کی ہی ندوہ کے ارکان و شرکا میں مولانا شبلی بھی تھے اگر مولانا شروانی کو ان کی برأت مقصود ہوتی تو صاف طور پر لکھتے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک نہ تھے مولوی عبدالحق نے ایک مستند روایت پر جو خود مولانا شبلی کی نظر سے گزر چکی تھی ان کو شریکِ جرم قرار دیا ہو ارتکابِ جرم میں اعانت بھی تو جرم ہی۔

تیسری جگہ ہمارے معاصرین کا حوالہ دیا گیا ہی لیکن کتاب کا صحیح نام "چند ہم عصر" ہی اب اس میں مولوی عبدالحق نے مولانا شبلی کے متعلق شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کے تذکرے میں بسلسلۂ قیام سررشتۂ علوم و فنون جو لکھا ہی وہ ناظرین خود ہی پڑھ کر مصنف حیاتِ شبلی کی داد دیں۔

(۱) انھوں[۱] نے شمس العلما مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمت ناظم سررشتۂ علوم و فنون پر بہ مشاہرہ (۱۰۰) ہوا اور درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا مولانا کی چند کتابیں بھی اسی سلسلے میں شائع ہوئیں (۲۵۶ مقدمات)

(۲) ایک روز مولانا شبلی مولوی عزیز مرزا مرحوم مولوی ظفر علی خاں[۲] مرحوم کے یہاں مدعو تھے بارہ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی متقدمین اساتذہ کے شعر سناتے رہے جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے مرحوم نے ان کی درخواست پر فوراً کامل مبرد کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ جس کی قیمت ستر روپیہ ہی مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ جیسا طالب علم جو خود کتابوں کا شوقین ہی اہلِ علم کی درخواست رد نہیں کر سکتا ...... مرحوم نے رد المنطق ابن تیمیہ اپنے خرچ سے نقل کرا کر

---

[۱] مولوی سید علی بلگرامی

مولوی شبلی کے نزدیک جب انگلستان پہنچ کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک
علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہے آپ وہ نسخہ بھجوا دیجیے مولانا اپنی عادت
کے موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سست لکھا بلکہ یہ
تک تحریر فرمایا کہ چوں کہ یہ کتاب آپ کے خرچ سے نقل ہوئی تھی اس لیے آپ طلب
کرتے ہیں۔ اس درشت اور عتاب آمیز خط کا یہ جواب دیا کہ پانسو روپے کی عمدہ
کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوا دیں چنانچہ اس کے بعد جب مولانا شبلی
سرکار عالی کی درخواست پر دارالعلوم کے نصاب تعلیم مرتب کرنے کے لیے حیدرآباد
تشریف لائے تو اس شرمندگی کے مارے مرحوم سے ملے نہیں لیکن کتب خانے کے
جلسۂ انتظامی میں اتفاق سے جب مڈبھیڑ ہو گئی تو مرحوم اسی خندہ پیشانی سے پیش
آئے جو ان کا شیوہ تھا۔ (۳۶۳ و ۳۶۴ مقدمات)

(۳) بے تعصبی وغیرہ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "ایک دن شمس العلما مولوی
شبلی نے پوچھا کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے شیعوں کو کیوں عداوت ہے حالاں کہ
انھوں نے شیعوں کے رد وغیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھی مرحوم نے فرمایا کہ رد
لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے بہت سے اسباب ہیں اگر آپ
ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی ان سے دشمنی ہوتی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی مولانا نے پوچھا وہ کیوں کر، فرمایا آدھی اسلامی دنیا
حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی نذر و نیاز کرتی ہے اور اٹھتے بیٹھتے ان کا نام لیتی ہے اگر
یہ شخص نہ ہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے، اگر اسی طرح آپ کی آدھی
سلطنت [illegible] تو [illegible] پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں" ۳۷۰ مقدمات

(۴) مرحوم کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی چنانچہ جب وہ حیدرآباد
سے وظیفہ لے کر انگلستان گئے تو وہ بھی شریک سفر تھیں جس زمانے میں مولانا

شبلی مرحوم کے ہاں مہمان تھے تو ایک روز فرمانے لگے کہ میں اس کا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ اُلٹا میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے آپ کو معلوم ہو کہ میری ایک بیوی ہے اور بچہ بھی میں اُسے نو مہینے چھوڑ کر آپ کے ساتھ کھاتا رہا۔
(۲۷۷ مقدمات)

یہ تو وہ اقتباسات ہیں جن کی نسبت مصنف حیاتِ شبلی نے اشارہ کیا ہے لیکن مقدمات سے ایک مزید اقتباس بھی اس موقع پر پیش کیا جاتا ہے۔ ماثر الکرام کے مقدمے میں نصابِ قدیم کی خامیوں پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "غرض صدہا سال سے ہمارے ہاں کی تعلیم حالت جمود میں تھی۔ سالہا سال کی بربادی اور تباہی کے بعد اب جاکر کہیں ہمارے علما کی آنکھیں کھلی ہیں اور آنکھیں کیا کھلی ہیں دعا دینی چاہیے اس باہمت اور عالی دماغ شخص کو جس نے اُس زمانے میں مسلمانوں کے سر سے بہت سی بلاؤں کو ٹالا اور مسلمانوں کو ان کی نازک اور پُر خطر حالت سے آگاہ و خبردار کیا یہ اُس کا طفیل نہیں تو اور کیا ہے کہ اسی کے صحبت یافتہ اور اسی کے دارالعلوم کے تربیت یافتہ ایک بزرگ عالم (یعنی شبلی) نے قدیم سلسلۂ تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے چنانچہ اس کے لیے سامان مہیا ہوتے جاتے ہیں خدا اس کی ہمت میں برکت اور اس کے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ (۲۵۷) مقدمات۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مواقع پر مولوی عبدالحق نے نکتہ چینی بھی کی ہے لیکن ادب و احترام اور محکم دلائل کے ساتھ، اور یہ کوئی بُرا ماننے کی بات نہیں اسی طرح مولانا کی نسبت اگر کسی واقعے سے "مصنف حیاتِ شبلی" کے معیار سے گری ہوئی بات نظر آجائے تو اس کا بیان بہ نظرِ تحقیر نہیں قرار دیا جانا چاہیے بلکہ بطور امر واقعہ سمجھنا چاہیے۔

کچھ متفرق

(۱) مصنف نے مولانا کی تصنیفات کو ادب و انشا کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ حضراتِ علما کو بھی بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا اور اب تو وہ علمی و مذہبی علوم کی ٹکسالی زبان بن گئی" (صفحہ ۲۴ حیات) اس کے بعد پھر دُور جاکر ایک رسالہ[1] قرات فاتحہ خلف الامام کا مقدمہ نقل کیا ہے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ "تاکہ معلوم ہو جائے کہ علی گڑھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں اُردو انشا پردازی کا کتنا زور تھا نیز یہ کہ دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ سرسید کی ملاقات اور ادبی تاثر سے پہلے بھی کس قدر تھا" (۱۰۴ حیات) کوئی شک نہیں کہ مولانا کی تصنیفات ادب و انشا کے معیار سے بھی بلند درجہ رکھتی ہیں لیکن یہ بھی سرسید کا فیض تھا، خود مولانا لکھتے ہیں کہ

"سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی بدولت ذرّے سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اُردو لٹریچر بھی ہے سرسید ہی کی بدولت اُردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر وسعت و جامعیت سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کی اُستاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اُٹھا سکتا ہو بعض بالکل اُن کے دامنِ تربیت

---

[1] صفحہ ۴۴ پر اس رسالے کی نسبت لکھتے ہیں کہ مگر اس کو اپنے نام سے نہیں چھپوایا۔

میں پہلے ہیں بعضوں نے دور سے فیض اُٹھایا ہی بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے ...... ۱۸۷۰ء میں جس کو آج کم و بیش ۲۷ برس ہوئے سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لیے تہذیب الاخلاق کا پرچہ نکالا اور اُردو انشا پردازی کو اس رتبے پر پہنچا دیا جس سے آگے ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہیں ...... زمانہ جانتا ہی کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں اُن کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تاہم اس سے مجھکو کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اُردو زبان میں ادا کیا ہی کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا" (سرسید اور اُردو لٹریچر مئی ۱۸۹۸ء)

مولانا کے یہ اعترافات خود شاہد ہیں کہ ان کا ادب و انشا سرسید ہی سے فیض پذیر تھا۔

مولانا شروانی سے تعلقات

مصنف رقم طراز ہی کہ :-

"المامون اہلِ علم کی نگاہوں میں اعتبار کے قابل ٹھہری اس پر اخباروں میں بہت سے ریویو نکلے ان میں قابلِ ذکر ریویو اس زمانے کے ایک خوش مذاق نوجوان رئیس عالم کے قلم سے نکلا جس کو ملک اب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان شروانی کے نام سے جانتا ہی، مولانا نے صرف اسی ریویو کا جواب ۲۱ فروری ۱۸۸۹ء کے آزاد لکھنؤ میں اس کے اڈیٹر کے بڑی درپے اصرار پر دیا تھا، مگر کیا عجیب یہ اختلاف تھا جس نے دونوں کو اتفاق کے ایسے مضبوط رشتے میں جکڑ دیا جو ایک کو مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ "

"علامۂ مرحوم سے میری سب سے اوّل ملاقات اندازاً ۱۸۸۸ء میں ہوئی
آغاز تعارف اختلاف سے ہوا کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ریویو
لکھا بعض اہم مسائل پر اعتراض تھا" غالباً یہی ایک ریویو تھا جس کا
علامۂ شبلی نے جواب لکھا یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا ؎
رسی آں گہ بہ دروں چمن   خامہ گیری و حرف بنگاری"

(۳،۷، احیات)

اس ریویو اور جواب ریویو کی داستان خود علامہ کی ہی زبان سے سنیے اور
اس طریق تدلیس کو دیکھیے جو مصنف نے برتا ہے۔ مولانا اڈیٹر کو لکھتے ہیں :-
"جناب من، آپ کے متواتر خطوط پہنچے کہ میں ان تحریرات کی طرف متوجہ
ہوں جو المامون کے متعلق اخبار آزاد میں شائع ہوئیں بے شبہ آپ کا
مقصود صرف یہ ہے کہ امر حق فیصل ہو جائے لیکن افسوس ہے کہ نہ مجھ کو فرصت
اور نہ اس قدر عام رائیں لحاظ کی مستحق ہیں آج کل جس کے ہاتھ میں قلم ہے
وہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا، میں کس کس کی طرف توجہ کروں گا، آپ کو بہت
بڑا شبہ یہ پیدا ہوا ہے کہ دولت عباسیہ میں رشید انتخاب کے قابل تھا
نہ مامون، ریویو لکھنے والوں نے بھی اس بات کو زیادہ طول دیا ہے اس امر
اور تمام دوسرے اعتراضات کا تصفیہ وہ شخص کر سکتا ہے جس نے نہایت
وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کیے ہیں اور ساتھ ہی باریک بیں
اور تاریخی اصول کا نکتہ شناس بھی ہو"

اس عبارت میں مولانا نے کہیں خوش مذاق نوجوان انہیں عالم کی رائے کو کوئی
خصوصیت نہیں بخشی بلکہ تمام رایوں میں شمار کر کے ناقابل لحاظ ٹھیرایا ہے اور نہ ان
کی معلومات تاریخی اور تاریخی اصول کی نکتہ شناسی کی کوئی قدر و منزلت کی ہے بلکہ

صاف صاف تحقیر کی ہے، اور اُن کو قابل الذکر شخصیت کے درجے میں بھی نہیں رکھا بلکہ اپنا مخاطب اڈیٹر کو قرار دیا ہے اور اڈیٹر سے ہی مقصود کو پیش نظر رکھا ہے۔ تمام مضمون میں رشید و مامون کا مختصراً موازنہ کرتے ہوئے رشید کی بُرائیاں بیان کی ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ

"المامون پر جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں نہ اسی طرح تفصیل طلب ہیں جس طرح رشید و مامون کا موازنہ۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی اوقات کو ان فضول باتوں میں صرف کروں آپ یقین فرمائیں کہ مجھ کو کبھی عام لوگوں کی تحسین سے خوشی ہوئی نہ اُن کے اعتراض سے رنج میں چاہتا ہوں کہ لوگ اعتراض کریں آپ کا جی چاہے تو ان کے جواب کی طرف متوجہ ہوں مجھ کو چھوڑ دیجیے کہ رائل ہیروز کے باقی حصے پورے کر دوں ؎

رسی آں کہ بددرد من چہ من خامہ گیری و حرف بنگاری

(مقالات شبلی جلد ہشتم، المامون)

دیکھیے کہ علامہ شبلی نے ان ریویو نگار کو قابلِ خطاب بھی نہیں سمجھا نام تک کا پتا نہیں اور اعتراضات کو فضول قرار دے کر جواب کا مجاز بھی اڈیٹر کو کیا ہے اور بے نیازانہ شعر کا مشار" الیہ بھی اڈیٹر ہی ہے کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نے اسی ریویو کا جواب دیا تھا یہ رئیس عالم کی خوش مذاقی کی دلیل نہیں ہوگی اگر اس کو وہ اپنی طرف منسوب کریں، البتہ مصنف کی نذر ہائے عقیدت میں یہ بھی ایک نذر ہے جو اس صدر نشین ریاست و علم کے حضور میں پیش کی گئی ہے۔

(۲) قرض سے سبک دوشی دسمبر ۱۹۰۲ء تک چھ ہزار قرض کا بوجھ تھا، مگر چند مہینوں کے بعد پانچ ہزار کسی طرح ادا ہو گئے اور صرف ایک ہزار رہ گیا (۳۰۶) اس قرض سے مولانا اتنے پریشان تھے کہ دسمبر ۱۹۰۲ء میں اپنا محبوب کتب خانہ بھی

علاحدہ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور اپنے حبیب لبیب شروانی کو جو اس متاع کے خریدار ہو سکتے تھے مطلع بھی کر دیا تھا۔ لیکن پھر چند ماہ میں اس کا بڑا حصّہ "کسی طرح ادا ہو جاتا ہے" یہ کسی طرح تو سمجھ میں نہیں آتا بجز اس کے کہ اس "کسی طرح" کے پردے میں مولانا شروانی ہی ہوں یا کوئی اور، بہرنوع یہ کسی طرح بغیر اس خودداری کو (جس کا ہر جگہ مصنّف نے بڑی آن بان سے تذکرہ کیا ہے) قربان کیے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۴) دیسی زبان کی یونی ورسٹی کی تحریک، "ہندوؤں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ اگر اردو کی کوئی یونی ورسٹی بنے تو ہندوؤں کے لیے ہندی کا انتظام کیا جائے، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی یونی ورسٹی کی تجویز ناکام رہی ص۱۰۲ مگر یہ تحریک تو برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے کی تھی جس میں ہندو بھی شریک تھے حکومتِ ہند اور وزارتِ ہند نے اصولاً تسلیم کر لیا مگر چوں کہ یونی ورسٹی کے معیار پر دیسی زبان میں کتابیں نہ تھیں اس لیے عملی شکل میں یہ تحریک نہ آسکی"

(۵) ندوہ کی سرکاری امداد، "ترکِ موالات کے زمانے میں ندوہ نے اس رقم کو لینے سے انکار کر دیا بعد کو راجہ کشن پال سنگھ رئیس کوٹلہ نے اپنی وزارت تعلیم کے زمانے میں مولانا حبیب الرحمان شروانی کی سفارش پر دوبارہ جاری کر دیا جو اب تک جاری ہے" (۴۷۷) عجب کہ ندوہ نے تو انکار کر دیا اور صرف ایک شخص کی سفارش سے وزیر تعلیم خود بہ خود جاری کر دیتا ہے۔ مصنّف نے واقعہ کی شکل نہایت بھدّے طریقے پر بدلی، ترکِ موالات کی حماقتوں میں سے یہ بھی ایک تھی۔ لیکن جب اخراجات کی دقتیں محسوس ہوئیں تو پھر طرح طرح کی عاجزیوں اور معذرتوں سے اُسی مُردار کی طرف دوڑے اور اسی حزم سے پیٹ پالنا پڑا، جس چیز پہ علمائے کرام نے حرام کا متفقہ فتویٰ دیا تھا۔

(۶) امداد بھوپال کا اضافہ، یہ وہ احسانِ عظیم تھا جس نے مولانا جیسے خود دار شاعر کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی سپاس گزاری کو ایک قصیدے کی صورت میں ظاہر فرمائیں چنانچہ عمر میں پہلی دفعہ اپنی خوشی سے وہ مدحیہ قصیدہ لکھا (۸۹۴) گویا اب تک کے قصائد جبر یہ لکھے تھے۔ اسی صفحے سے پہلے صفحے پر بیگم صاحبہ جنجیرہ کے ایک ہزار کے عطیے کا بھی قطعۂ شکریہ ہے، اور عمر کے پہلے حصے میں پہلا قصیدہ سرسید کی مدح میں بھی ہے (مولانا خود دار ضرور تھے مگر قومی معاملات میں وہ ہمیشہ بغیر جبر کے خوشی سے ہی مدحیہ نظمیں لکھتے تھے، جن کی تعداد بھی کم نہیں حتیٰ کہ مسٹر جوزف بک کی دعوت کے موقع پر ان کی بہترین نظم نظر آتی ہے)

(۷) ندوہ میں سر آغا خاں، آخر جنوری ۱۹۱۰ء میں دہلی میں مسلم لیگ کے ایک جلسے میں جس میں مولانا وقف علی الاولاد کے مسئلے کو پیش کرنے کی غرض سے گئے تھے مولانا کی ملاقات سر آغا خاں سے ہوئی موصوف نے ندوہ کے متعلق کچھ مشورے کیے اس تقریب سے مولانا نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ میں ندوہ کو دیکھتے جائیں جس کو انھوں نے بخوشی منظور کیا" (۴۹۴)

واقعے کو پلٹنے اور جھوٹ سچ کی آمیزش کی یہ حیرت انگیز مثال ہے۔ سر آغا خاں نے اب تک ندوہ سے کہیں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی مگر وہ مولانا سے اتفاقیہ ملاقات میں ندوہ کے متعلق مشورے بھی کرنے لگے اور یہی تقریب ان کے معائنۂ ندوہ کی بھی ہوئی! واقعہ یہ ہے کہ ہز ہائی نس آغا خان کو خود مولانا نے ندوہ کی طرف توجہ دلائی! اور چوں کہ ان کے اثر سے مولانا کو فائدہ اٹھانا مقصود تھا اور موقع بھی نادر تھا کہ وہ لفٹنٹ گورنر (سر جان ہیوٹ) سے ملنے کے لیے لکھنؤ آرہے تھے ان کو دعوت دی چنانچہ ہز ہائی تشریف لائے اور نہ صرف اخلاقی طور پر ندوہ متمتع ہوا بلکہ مالی طور پر بھی ہز ہائی نس نے امداد کی اور اسی تمتع اور امداد کا نتیجہ تھا

کر ۱۹۱۱ء میں جب ہز ہائی نس نے مسلم یونی ورسٹی فنڈ کے لیے پنجاب کا دورہ کیا تو مولانا بھی لاہور گئے اور ایک بڑے جلسے میں اپنی نظم بھی سنائی جس میں ہز ہائی نس کی بہت کچھ مدح و ستایش تھی۔

۸۔ سیرت النبی ؛ مولانا کی ندوہ کی تقریروں کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۱۲ء کی ایک تقریر کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اس انقلاب کا راز ان دنوں سیرت نبوی اور احادیث شریف کا مطالعہ اور انہماک تھا جس نے ایک ہی دو سال میں علی گڑھ کے مولوی شبلی کو ایک نیا مولوی شبلی بنا کر کھڑا کر دیا تھا جو ہمہ تن دل اور مجسم محبت بن گئے تھے" (۵۰۴) تعجب ہے کہ علی گڑھ سے جدا ہونے کے ۱۴ سال بعد تک بھی مولوی شبلی علی گڑھ کے ہی رہے جہاں رسولؐ کی محبت نہ تھی، جس تقریر پر مصنف کا یہ ریمارک ہے وہ ۲۲ مارچ ۱۹۱۲ء کی ہے صفحات ۷۰۲ و ۷۰۳ پر عزم تالیف سیرت کے ذیل میں تحریر ہے کہ "۱۹۱۲ء کے شروع میں ان کے ارادے نے عزم کی صورت اختیار کر لی چنانچہ محرم ۱۳۳۰ء مطابق جنوری ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا ...... اب مصنف نے احادیث و سیر کا مطالعہ شروع کیا اور جیسے جیسے یہ مطالعہ بڑھتا گیا نظر میں وسعت، دل میں تڑپ اور روح میں بالیدگی بڑھتی گئی" ان دونوں عبارتوں کو ملا کر پڑھنے سے مصنف کا پہلا بیان کس قدر عجیب معلوم ہوگا کہ ایک ہی دو سال میں یہ انقلاب ہوا، حالاں کہ اگر انقلاب مان بھی لیا جائے تو اس کے ایک ہی دو مہینے ہوتے ہیں، اصل یہ ہے کہ مصنف نے اس سلسلۂ بیان میں بھی علی گڑھ پر ایک طنز کے لیے وقت کی گنجائش نکالی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے دل میں سیرت کا خیال بھی علی گڑھ ہی سے پیدا ہوا تھا جب کہ انھوں نے طلبا کے لیے سیرت پر ایک رسالہ لکھا اور یہ خیال بھی سر سید کی خطبات احمدیہ کے مطالعہ کا نتیجہ تھا۔

(۱۰) امداد سیرت کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ "منشی محمد امین صاحب زبیری نے جو ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال کے لٹریری سکریٹری تھے سرکار سے عرض کیا کہ حضور آج کونین کی دولت لٹ رہی ہے آپ اس کو بڑھ کر کیوں نہیں اٹھا لیتیں یعنی ایک عاشق رسول مصنف گلے میں جھولی ڈال کر سیرت نبوی کی تصنیف کے لیے قوم سے بھیک مانگنے نکلا ہے یہ عزت حضور کیوں نہیں حاصل کر لیتیں اور اس فقیر کی جھولی میں ڈھائی سو ماہوار ڈال دیتیں کہ وہ دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جائے، یہ بات بیگم صاحبہ کے دل میں اتر گئی انھوں نے اس حصول سعادت کی رضامندی ظاہر کی منشی صاحب نے مولانا کو مطلع کیا اور اپریل ۱۹۱۲ء کے شروع میں اُن سے باقاعدہ درخواست منگوائی۔"

(ص ۲۰۵ و ۲۰۶) ان فقروں میں جو ادبی شان ہے اس کو ہم ناظرین کے ذوق ادب پر چھوڑتے ہیں، البتہ خط کشیدہ الفاظ پر نظر ڈال کر یہ ضرور دیکھا جائے کہ کوئی سکریٹری اپنے فرماں روا آقا سے اس قسم کا گستاخانہ تخاطب کر بھی کر سکتا ہے؛ نیز اس موقع پر "رضامندی" کا لفظ تو انتہائی بھدا اور ناموزوں ہے مصنف نے راقم کے نام کے ساتھ لٹریری سکریٹری کا انتساب محض اپنی مہربانی سے کر دیا ورنہ نہ تو یہ عہدہ بھوپال سول لسٹ میں ہے اور نہ کبھی راقم نے لکھا، واقعہ یہ تھا کہ جب الندوہ میں مولانا نے اعلان شائع کیا جس میں چندہ کی بھی درخواست تھی تو راقم نے اپنے عریضے کے ساتھ اس کو توجہ فرمانے کی غرض سے پیش کیا، سرکار عالیہ کو ایسی سیرت کی ضرورت و اہمیت کا پورا احساس تھا اور حضور ممدوحہ نے نامناسب تصور فرمایا کہ اس مقصد کے لیے چندہ کیا جائے اور حصول سعادت کے لیے تمام مصارف کی خود کفالت فرمائی۔

تذکرہ شبلی

ولادت و تربیت اور تعلیم

مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں بہ مقام قصبۂ بندول (ضلع اعظم گڑھ) پیدا ہوئے جب دورِ طفلی میں پہنچے تو اعظم گڑھ میں (جہاں ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکالت کرتے تھے) تعلیم کا آغاز ہوا، فارسی کی تکمیل اور عربی کی درجہ ثانوی تک تعلیم کے بعد غازی پور میں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ ازاں بعد رام پور میں کچھ عرصے تک مولوی عبدالحق خیرآبادی کے حلقۂ درس میں شامل رہے اور مولوی ارشاد حسین سے فقہ پڑھی یہاں سے لاہور گئے اور مولوی فیض الحسن سے عربی ادب کی تکمیل کی پھر سہارن پور میں مولانا احمد علی محدث سے درسِ حدیث لیا" اس طرح ۱۹ سال کی عمر میں اس زمانے کے مشاہیر علما سے معقولات و منقولات اور ادبیات میں مستفید ہوئے مگر دیگر فارغ التحصیل طلبا کی طرح دستارِ فضیلت یا کسی شعبے کی سندِ تکمیل حاصل نہیں کی،

حج اور مشاغل

۱۸۷۶ء میں جب کہ ۱۹-۲۰ سال کی عمر تھی اپنے بعض اعزا کے ہمراہ حج و زیارت کو گئے واپسی کے بعد مولانا کے دو مشغلے تھے ایک شعر و سخن اور مطالعہ کلام اساتذہ دوسرا غیر مقلدی کی تردید میں تصنیف و تالیف اور مناظرہ، مولانا اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور تسنیم تخلص تھا تصنیف و تالیف اردو فارسی اور عربی میں کرتے تھے ایک عربی رسالہ اسکات المعتدی جماعت مقلدین میں بہت مقبول ہوا اور شام وغیرہ میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، بعض رسائل دوسروں کے نام سے شائع کیے۔

تاہل اور حصولِ معاش

مولانا آغازِ شباب ہی میں متاہل ہو گئے۔ اب تو مسائل معاش کی طرف توجہ ناگزیر تھی گھر میں زمیں داری بھی اس کا کاروبار سپرد ہوا مگر یہ طبیعت کے مناسب نہ تھا، اس زمانے میں اضلاع میں وکالت کے لیے یونی ورسٹی اسناد کی قید نہ تھی اُردو میں امتحان پاس کر لینا کافی تھا باپ اچھے وکیل تھے مولانا بھی امتحان دے کر وکیل ہو گئے، چند مہینے کام کیا مگر یہ پیشہ بھی موزوں ثابت نہ ہوا پس ملازمت اختیار کی اور تحصیل میں امین مقرر ہو گئے لیکن اس دلدل سے پھنستے ہی نکل آئے اور پھر مطالعہ اور درس تدریس میں مشغول ہو گئے۔

علی گڑھ سے تعلق

علی گڑھ تحریک یوں تو ۱۸۶۶ء سے شروع ہو چکی تھی لیکن صحیح طور پر اس کا آغاز ۱۸۷۰ء سے ہوا جب کہ سر سید احمد خاں نے انگلستان سے واپس آ کر رسالہ تہذیب الاخلاق جاری اور انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان (۱۸۷۰ء) قائم کی اس تحریک کا اثر پوربی اضلاع میں بھی بہت کافی ہوا چناں چہ ۱۸۷۵ء میں جب مدرسۃ العلوم جاری ہوا اور بعدہٗ ۱۸۷۷ء میں جب وہ کالج کی حیثیت میں آیا تو ان اضلاع کے اچھے اچھے مسلمان خاندانوں کے لڑکے اس جدید تعلیمی ادارے میں داخل ہوئے شیخ حبیب اللہ کے لڑکوں میں مولانا شبلی تو مولوی بن چکے تھے منجھلے لڑکے (مہدی حسن) تعلیم کے قابل تھے جو کالجیٹ اسکول میں داخل کیے گئے، اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شیخ صاحب اُن سے ملنے کے لیے آئے اور مولانا شبلی کو بھی ساتھ لائے سر سید سے ملنے کو گئے مولانا بھی ہم راہ تھے، اس زمانے میں سر سید کی یادگار کا چندہ جاری تھا باپ نے پچاس روپیہ چندہ میں نذر کیے اور بیٹے نے ایک قصیدہ (عربی میں) پیش کیا جس میں سر سید کے حسب نسب اور توفیقات وغیرہ کی تعریف و توصیف تھی۔

دوسرے سال ۱۸۸۲ء میں عربی و فارسی کے ایک معلم (اسسٹنٹ پروفیسر) کی ضرورت ہوئی، مولانا فیض الحسن صاحب کی سفارش کے ساتھ مولانا شبلی نے بھی درخواست پیش کی اور للعہ ماہانہ پر ان کا تقرر ہو گیا اور یکم فروری ۱۸۸۳ء سے مولانا نے کام شروع کر دیا۔

مولانا کی علمی تربیت

اب مولانا شبلی کو ایسا ماحول ملا جو ان کے فطری مذاق کے مطابق تھا اور جس میں اُن کے قوائے علمی بیدار اور جوہر مجلّا ہوں، سرسیّد کے حلقے میں اس وقت تک جو اصحاب داخل تھے وہ ملک میں اپنی علمی ساکھ قائم کر چکے تھے اور (زیادہ تر) تہذیب الاخلاق کے ذریعہ ملک میں اُن کی شہرت پھیل چکی تھی یہ سب مولانا سے (جو ۲۴ سالہ نوجوان تھے) عمر میں بڑے اور بعض تو بہت[۱] بڑے تھے۔ ان سب کے علمی کارنامے مولانا کی نظر سے گزرے سرسیّد کی جوہر شناس نظر نے شبلی کے فطری جوہر کو پرکھ لیا اور بہت جلد اپنی کوٹھی کے احاطے میں ایک چھوٹا سا بنگلہ (جو اب تک شبلی کی بنگلیا کہلاتا ہے) ان کے قیام کے لیے مخصوص کر دیا اور اپنے کتب خانے سے استفادہ کی رہبری کی، یہ واقعہ پھر اور خود مولانا نے راقم سے بیان کیا تھا کہ جب وہ سرسیّد سے پہلے دن انٹرویو کے لیے آئے تو سرسیّد نے ان کو کتب خانے میں بٹھایا، شیشے دار الماریوں میں مجلد کتابیں تھیں اور قفل لگے ہوئے تھے مولانا کہتے تھے کہ میں الماریوں کے پاس کھڑے ہو کر کتابوں کے نام دیکھتا رہا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اسی حالت میں گزر گیا تو سرسیّد نے کہلا بھیجا کہ کل آؤ جب میں دوسرے دن گیا تو پھر کتب خانے میں بٹھایا گیا مگر آج سب قفل کھلے ہوئے تھے اب میں نے کتابیں نکال کر دیکھنا شروع کیا جب کافی وقت گزر گیا تو پھر کل حاضری کا حکم ہوا اور دونوں دن کی طرح کتب خانے میں

---

[۱] سرسید ۶۰ سال مولوی نذیر احمد ۴۶ سال۔

بیٹھا لیکن آج دو تین کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں میں نے کل جو کتابیں دیکھی تھیں ان میں سے دو چار انتخاب کرکے پاس رکھ لیں اور مطالعے میں منہمک ہوگیا جب کل کے مقابلے میں بہت زیادہ وقت گزر گیا تو سرسید خود ہی تشریف لائے اور فرمایا کہ مولوی شبلی انٹرویو ہوگیا، جاؤ اور کام شروع کردو، اس کتب خانے میں (زیادہ تر) مسلمانوں اور اسلام کے متعلق یورپ اور مصر و شام کی جدید مطبوعات داخل ہوتی رہتی تھیں، خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن لکھنے کے سلسلے میں اس قسم کا نادر ذخیرہ موجود تھا اسی کے ساتھ سرسید کی صحبت جس میں علمی و قومی مذاکرات رہتے تھے بجائے خود دامانِ تربیت تھی اس تربیت اور ماحول نے نوجوان شبلی میں ایک انقلاب پیدا کردیا جو ان کے بزرگ معاصرین میں ہوچکا تھا اور اس انقلاب کا پہلا اثر مولانا کی شاعری پر ہوا ہنوز کالج میں آئے ہوئے مہینہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ سالار جنگ اوّل کی رحلت پر فارسی مرثیہ لکھا اور دوسرے سال ۱۸۸۳ء میں مثنوی صبح امید لکھی جس میں مسلمانوں کی غفلت و جمود سرسید کی منادی اور کالج کی ابتدائی تاریخ کے ساتھ قوم کو ابھارا ہے یہ مثنوی ان کی قومی شاعری کا دیباچہ ہے اور یہ چراغ مولانا حالیؔ کے چراغ سے روشن ہوا ہے ۱۸۸۶ء میں جب تعلیمی کانفرنس قائم ہوئی تو پہلی مرتبہ مولانا قومی پلیٹ فارم پر ایک مقرر کی شان سے نمودار ہوئے اور ایک رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے دل نشین تقریر کی، دوسرے سال مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ایک تاریخی رسالہ پیش کیا جو کانفرنس کی طرف سے شائع ہوا اور سرسید نے اس پر ریویو کیا

ترقی | ان تین سال ۱۸۸۳ء تا ۱۸۸۶ء میں مولانا شبلی کے جوہر نمایاں ہوئے ان سے وہ اپنے بزرگ معاصرین کے جاذب توجہ اور مرکز امید بن گئے اور ۱۸۸۸ء میں مولوی محمد اکبر پروفیسر عربی کی جگہ خالی ہونے پر درجے کی ترقی بھی مل گئی۔

۱؎ ۱۸۷۹ء میں مسدس حالی شائع ہوچکا تھا۔

یعنی اب مولوی شبلی پروفیسر شبلی ہو گئے، ۱۸۸۸ء میں جب پروفیسر آرنلڈ ایم لے
جو ہمہ تن ذوقِ علم تھے ایم اے او کالج میں پروفیسر فلسفہ و منطق مقرر ہوئے تو ان دونوں
کے باہمی علمی تعلقات کا آغاز ہوا اور ایک نے دوسرے سے استفادہ شروع کیا۔

سیاحت بلادِ اسلامیہ

اپریل ۱۸۹۲ء میں مولانا نے علمی مقصد سے ٹرکی
اور مصر و شام کا سفر کیا تین مہینے قسطنطنیہ میں مقیم
رہے اور زیادہ وقت کتب خانوں علمی مشغلوں مدارس کے معاینوں میں گزارا ترکوں
کی علمی و معاشرتی حالت بہ نظرِ غائر دیکھی متعدد اہلِ علم سے صحبتیں رہیں سلاملق کی رسم
بھی دیکھی اور اس سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی ایم اے او کالج ترکی کے سرکاری
حلقوں میں پہلے سے متعارف تھا اس لیے اس کے پروفیسر کی حیثیت سے بھی
خاص حلقوں میں مولانا کا اور زیادہ احترام ہوا غازی عثمان پاشا سے ملاقات ہوئی
اور (غالباً انھیں کی تحریک سے) بارگاہ سلطانی سے تمغہ مجیدی (درجہ چہارم عطا
ہوا اور سلطانی فرمان میں کالج کے پروفیسر کی حیثیت ہی لکھی گئی مولانا نے قسطنطنیہ سے
متعدد خطوط اپنے والد اور سرسید کو لکھے کبھی ان میں سے کسی کو ایک ہی خط لکھتے اور
وہ دوسرے کے پاس بھیج دیا جاتا سرسید اپنے نام کے خطوط خواہ کتنے ہی مختصر ہوتے
انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کرتے رہتے۔ قسطنطنیہ سے مولانا بیروت دبیت المقدس
ہوتے ہوئے مصر آئے ان مقامات میں بھی وہی علمی مشاغل تھے اور علما و فضلا کی
صحبتیں رہیں مصر میں جامعہ ازہر کا بڑے غور سے معاینہ کیا، غرض چھ ماہ بعد واپسی
ہوئی اور جہاز سے اتر کر سیدھے علی گڑھ آ گئے۔

خیر مقدم

کالج میں نہایت شاندار خیر مقدم ہوا اسکول اور کالج اساتذہ کی
طرف سے ڈنر ہوئے خیر مقدم کی نظمیں پڑھی گئیں ایک ڈنر میں
مولانا نے ایک نظم متضمن بہ حالات سفر پڑھی۔

تمغے کا عام استعمال اور شمس العلما کا خطاب

۱۸۸۶ء میں برطانوی رعایا کو ممالک غیر کے تمغوں کے استعمال کی جب تک گورنمنٹ سے قبل اجازت نہ حاصل کر لی جائے ممانعت کر دی گئی تھی اور مولانا کو بغیر اجازت ماقبل تمغہ ملا تھا اس لیے وہ اس کو استعمال نہ کر سکتے تھے اور اس کا سب ہی کو افسوس ہوا۔ سر سید کو مولانا کے ساتھ جو پدرانہ شفقت تھی انھوں نے اس احساس محرومی کے بدل کے لیے کوشش کی کہ خود حکومت مولانا کی علمی خدمات کا اعتراف کرے حسن اتفاق سے سر الفریڈ لائل لفٹننٹ گورنر کا زمانہ تھا جو سر سید کے نہایت دوست اور کالج کے بڑے مداح اور رسم درست طور پر پروفیسروں کے لیے ایسے اعزاز کی مثال بھی موجود تھی یعنی سر سید کے حلقۂ احباب میں مولوی ذکاء اللہ خاں پروفیسر میور سنٹرل کالج کو "شمس العلما" کا خطاب مل چکا تھا۔ سر سید کی کوشش کامیاب ہوئی اور جنوری ۱۸۹۴ء کے خطابات نوروزی کی فہرست میں مولوی شبلی کے سامنے "شمس العلما" کا خطاب تھا۔

مولانا کو بڑی مسرت ہوئی اور صبح کو اطلاع ملتے ہی پچاس روپیہ اس خوشی میں کالج کو نذر کیے۔ طلبا اور اسٹاف کو جو مسرت ہوئی.......... وہ دعوتوں کی صورت میں ظاہر کی گئی ایک بڑی دعوت جس میں سر سید بھی تھے اور نواب محسن الملک کی صدارت میں ہوئی تھی بڑی زوردار تقریریں ہوئیں محسن الملک نے مولانا کے کمالات علمی کو ایک خاص انداز میں سراہا اور مولانا نے جو جوابی تقریر کی وہ بھی بہت پُر جوش تھی جس میں خطاب کا شکریہ، حکومت کی تعریف، کالج کی عظمت اور اپنی اس حیثیت کا ذکر جو اس ماحول میں ہوئی نہایت منت پذیری کے ساتھ کیا تھا

کالج میگزین کی ادارت

۱۸۹۴ء میں کالج میگزین کا مستقل اور جداگانہ انتظام ہوا تو اس کی اشاعت دو حصوں انگریزی

اور اُردو) میں قرار پائی۔ انگریزی حصے کے مسٹر بک پرنسپل اور اُردو کے مولانا شبلی مقرر ہوئے اور مولانا نے اس میں دو ڈھائی سال تک نہایت بیش قیمت تاریخی مضامین لکھے۔

حیدر آباد سے وظیفہ مولانا اگرچہ کالج میں بھی تصنیف و تالیف کرتے رہتے تھے لیکن ۱۸۹۶ء میں اُن کو خیال ہوا کہ معمولی درس و تدریس سے آزاد رہ کر تصنیف و تالیف میں مستقلاً مشغول ہوں ۱۸۹۶ء میں نواب سر آسماں جاہ مدار المہام دولت آصفیہ نے مولانا حالی کا وظیفہ یا منصب اسی مقصد سے مقرر کیا تھا کہ ملازمت سے یکسو ہو کر قومی و علمی کام کریں اب نواب سر وقار الامرا کا دور تھا اور وہ مولانا سے پہلی مرتبہ جب سر سید کی معیت میں حیدر آباد گئے تھے اور پھر جب ۱۸۹۵ء میں نواب ممدوح نے کالج وزٹ کی تھی اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اس لیے مولانا نے حیدر آباد کا رخ کیا اور وہاں مولوی عزیز مرزا اور مولوی سید علی بلگرامی کی وساطت سے درخواست پیش کی جس میں اپنا مقصد بھی ظاہر کر دیا چنانچہ سو روپیہ کا ہولدار وظیفہ مقرر ہو گیا لیکن اس وقت مولانا نے کالج سے قطع تعلق مناسب نہ جانا۔

کالج سے قطع تعلق مارچ ۱۸۹۸ء میں سر سید کا حادثۂ انتقال پیش آیا مولانا پر بھی اس کا سخت اثر ہوا اوّل طویل رخصت لی اور پھر اسی سال استعفا دے دیا اس طرح مولانا کا پہلا دورِ زندگی ختم ہوا۔

پہلے دور کا کام مولانا جب کالج میں ملازم ہوئے تو ۲۴-۲۵ برس کی عمر تھی لیکن جو آثار کہ ان کی پیشانی سے ہویدا تھے ان کے باعث سر سید اور ان کے تمام رفقا ان سے محبت کرتے تھے اور ان جوہروں کے چمکنے کے آرزومند تھے جو شبلی کی فطرت میں ودیعت تھے خود مولانا میں ایک جذبہ و جوش تھا ان کے سامنے سر سید مولانا نذیر احمد، مولانا حالی محسن الملک، وقار الملک مولوی چراغ علی

(اعظم یار جنگ) مولوی ذکاء اللہ خاں مولوی سید علی وغیرہ وغیرہ کے علمی و ادبی اور قومی و ملّی جذبات کے نمونے اور کارنامے تھے، استفادے کے لیے سر سید کا نادر کتب خانہ تھا یہ جوہر روز بہ روز چمکنے لگے، مولانا کے موضوعات شاعری اور تصانیف کے رُخ بھی بدل گئے، نظم میں قصیدہ عیدیہ فارسی اور اردو مثنوی صبح امید سے اور نثر میں گزشتہ تعلیم سے اس کی ابتدا ہوئی۔

اس دور میں مختلف مقالات و مضامین کے علاوہ المامون (جس کی اشاعت ثانی پر سر سید نے دیباچہ لکھا) سیرۃ النعمان سفرنامہ تین مستقل تصانیف کیں ایک رسالہ بدء الاسلام (سیرت نبوی) عربی کے منتہی طلبا کے لیے تالیف کیا، الٰہ آباد یونیورسٹی کے نصاب فارسی کے لیے ایک مجموعہ مرتب کیا، سلسلہ نام وران اسلام میں الفاروق کے لیے مواد جمع کیا بلکہ کتاب ہی شروع کر دی۔ سر سید کا خیال تھا کہ الفاروق کو اگرچہ وہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ اس کے لکھنے کے اہل ہیں لیکن فیہ مافیہ کی ہفت خوان طے نہ کر سکیں گے اس لیے ان کا یہ اصرار مشورہ تھا کہ اس کی جگہ الغزالی لکھیں جو علمائے زمانہ کی اصلاح خیالات کے لیے ضروری ہے لیکن مولانا نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا الفاروق کی تکمیل و اشاعت سر سید کے بعد ہوئی اور مولانا نے الغزالی بھی بعد کو لکھی اور شائع کی۔

کالج کے دور میں مولانا کی فارسی غزلیں اُردو نظموں کے مقابلے میں زیادہ ہیں عموماً امرا و مشاہیر کی تشریف آوری کے موقع پر مولانا قصائد لکھتے تھے چنانچہ خلیفہ سید محمد حسین وزیر پٹیالہ نواب سر آسمان جاہ .... اور نواب سرو قار الامراکی وزٹ اور حیدر آباد وفد کے موقع پر جو قصیدے لکھے وہ ان کی فارسی شاعری کے بہترین نمونہ ہیں مسٹر جوزف بیک کے ڈنر پر بھی ایک فارسی نظم (مختصر) انھوں نے لکھی ۱۸۸۹ء کی کانفرنس کا ترکیب بند غالباً فارسی کی قومی شاعری

کا پہلا نمونہ ہے۔ وفد حیدرآباد اور ممالک اسلامیہ کے سفر پر بھی انھوں نے فارسی میں نظمیں لکھی تھیں

اردو میں مثنوی صبح امید کے بعد ۱۸۸۸ء میں مولانا نے اپنے یہاں طلبا کے اجتماع میں مسٹر جیوزف بک کو مدعو کر کے ایک قصیدہ پڑھا تھا جس میں طلبا کو خطاب کیا گیا تھا۔ ایک ترکیب بند ۱۸۹۳ء کی کانفرنس کے اجلاس میں اور ایک مسدس ۱۸۹۴ء میں قومی تھیٹر (بمبئی ریڈنگ) میں پڑھا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں سید محمود کی تقریب شادی کی تہنیت میں بھی ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں ان کے مخالفوں پر بھی تعریض کی تھی۔

عربی نظم میں پہلا قصیدہ تو ۱۸۸۴ء میں سرسید کی مدح میں ہے اور دوسرا قصیدہ ۱۸۹۱ء میں ان علمی صحبتوں کے تذکرے میں جو حیدرآباد دکن کے موقع پر نواب عماد الملک کے یہاں منعقد ہوتی رہیں۔ یہ قصیدہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا

مولانا نے کالج میں آنے کے پہلے ہی سال انگریزی تعلیم کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی اور اعظم گڑھ میں ایک نیشنل اسکول قائم کرایا۔ ۱۸۹۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی منتخب ہوئے اور وقتاً فوقتاً جلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ اس طرح یونیورسٹی میں فارسی جماعت کا ایک ستون بن گئے۔ اس امر کا ہر شخص معترف ہے کہ مولانا کے ذوق علم اور علمی انہماک کا طلبا پر بہت گہرا اثر پڑتا تھا اور اس زمانے میں بعض طلبا تو ایسے اثر پذیر ہوئے کہ ملک میں انھوں نے شہرت و حیثیت حاصل کر لی

ندوۃ العلما میں شرکت

۱۸۹۴ء میں جب ندوۃ العلما کی بنیاد پڑی تو سرسید نے اس کی زبردست تائید کی۔ کانفرنس میں تائید کی تجویز پاس ہوئی۔ ۱۸۹۵ء کے پہلے اجلاس میں علی گڑھ سے مولانا عبداللہ انصاری ناظم دینیات اور مولانا شبلی نے شرکت کی، اور کالج میگزین میں مولانا نے اس کی روداد

نتائج کی یہ تحریک ان کے عین مذاق، خواہش اور امید کے مطابق تھی انھوں نے عربی تعلیم کی موجودہ حالت کے نتائج اس کی اصلاح اور علما کی یک جہتی اور اتفاق کی اہمیت و ضرورت پر علی گڑھ کے ماحول اور بلاد اسلامیہ کی سیاست میں پورا غور کیا تھا اب اپنے نتائج غور کو ندوہ کے جلسوں میں نہایت موثر طریقوں سے پیش کیا اور ایک بڑی جماعت کو اپنا ہم خیال اور ہمدرد بنا لیا اور ندوہ میں ان کی ایک موثر اور اہم شخصیت قائم ہو گئی

درستیٔ صحت و سفر کشمیر

اگرچہ ۱۸۹۹ء میں ان کا ارادہ تھا کہ مستقل طور پر ندوہ میں رہ کر اپنی تجاویز کو عمل میں لائیں لیکن اس عرصے میں صحت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ درستیٔ صحت کے لیے پہلے کچھ دن کشمیر میں بسر کیے، یہ سال زیادہ تر علالت میں بسر ہوا

تاہل بارِ ثانی

کشمیر سے واپسی کے چند دن بعد ۱۹۰۰ء میں طبی مشیروں کے مشورے سے دوسری مرتبہ تاہل کیا پہلی بیوی کا پانچ سال قبل انتقال ہو چکا تھا اب زیادہ قیام اعظم گڑھ میں رہا اور اس عرصے میں امام غزالی کی لائف کا خاکہ تیار کیا درس و تدریس اور نیشنل اسکول کی ترقی و استحکام کا شغل بھی رہا،

پریشانی کا زمانہ

مولانا کا برنا اہل ان کے فرزند کو جو اب نوجوان تھے نہایت شاق ہوا اور وہ قبل عقد ہی گھر سے بلا اطلاع دفعتاً چلے گئے اور فقیرانہ زندگی اختیار کر لی بہ ہزار پریشانی و تلاش بسیار ان کا پتہ لگا اور وہ واپس لائے گئے ماہ نومبر میں مولانا کے والد نے رحلت کی انھوں نے اخیر عمر میں شادی کر لی تھی اور اپنی جائداد کا ایک حصہ ہبہ کر دیا تھا مولانا کے تعلقات سوتیلی ماں اور ان کی اولاد سے اچھے نہ تھے اور جائداد کے متعلق نزاعات کا اندیشہ تھا مگر مولانا کی مصلحت بینی سے تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے لیکن جائداد پر

قرضے کا بارگراں تھا اس سے نجات دلانے کا بھی سوال سامنے تھا ان پریشانیوں میں
تازہ اضافہ یہ ہوا کہ بعض خود غرض اور حاسد بااثر اشخاص نے حکومت کو ندوہ کی
طرف سے بدگمان کردیا یہ دور سرانٹونی میکڈانلڈ لفٹننٹ گورنر کا تھا جو فطری طور پر
مسلمانوں کے مخالف تھے اور اردو کی جگہ ہندی کا اجرا کرچکے تھے جس کے متعلق علی گڑھ
سے سخت احتجاج ہو رہا تھا وہ اب ندوہ اور علی گڑھ تحریک کے ارکان سے ناراض
تھے اور اگرچہ مولانا کا اب علی گڑھ سے یا ان احتجاجی کارروائیوں سے تو کوئی تعلق
نہ تھا مگر ندوہ کے ایک بڑے رکن تھے اس لیے مولانا نے بدگمانیوں کے نتائج سے
محفوظ رہنے اور خانگی ضرورتوں کے دباؤ سے حیدرآباد جاکر قسمت آزمائی مناسب سمجھی۔

حیدرآباد کی ملازمت

مولانا فروری ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد گئے اور مئی تک
سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت پر ان کا تقرر ہوگیا؛
لیکن ندوہ سے ان کا تعلق بدستور رہا اگرچہ حکومت بدگمان کردی گئی تھی کسی مخالفانہ
کارروائی کا کوئی موقع نہ تھا مگر یہ بادل بھی ۱۹۰۳ء میں ہی چھٹ گئے حکومت صوبہ
کا جائزہ سرجیمس لاٹوش نے لیا جو ایک صاف دل اور بیدار مغز حکمران تھے علی گڑھ
کی پیچیدگیاں بھی سلجھ گئیں اور ندوہ کے معاملات بھی صاف ہوگئے۔ اس کے جلسے
علی التسلسل ہونے رہے مولانا کو جب موقع ملتا جلسوں میں شریک ہوتے اہم مسئلہ
تعلیم قدیم و جدید کے انضمام سے ایک نئے نصاب کی تیاری و تعلیم کا تھا مولانا اس
کے زبردست محرک و مؤید تھے اور باوجود شدید اختلافات کے انھوں نے اس کی
ضرورت و اہمیت تسلیم کرائی لیکن نئے نصاب کا اجرا نہ ہو سکا اس کا ان کو سخت
قلق تھا، ان کی تحریک سے اسی زمانہ میں ندوہ سے ایک رسالہ بھی جاری
ہوا، رسالے کا خاکہ خود ہی تیار کیا اور اس کا مقصد علوم اسلامیہ کا اشاعت تطبیق منقول و
معقول اور علوم قدیم و جدید کا موازنہ قرار دیا۔

نظامت سے استعفیٰ اور معتمدی دارالعلوم ندوہ

۱۹۰۵ء میں مولانا نظامت علوم وفنون سے مستعفی ہوگئے اور لکھنؤ[۱] آکر انھوں نے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی کا جائزہ لیا اور بڑی کوشش و محنت سے مجوزہ اصلاحات جاری کیں اور دارالعلوم کو جدید نصاب کے فوائد وبرکات کی ایک مثال بنادی ساتھ ہی صاف تھا اور مولانا جو کوششیں کرتے تھے کام یاب ہوتی تھیں، وہ اگرچہ دارالعلوم کے معتمد تھے مگر ندوہ کی ترقی واستحکام میں اتنا انہماک تھا کہ وہی مدار ندوہ بن گئے تھے، اور انھیں کا اثر ہر جگہ میں کام کررہا تھا۔

بیوی کا انتقال، بمبئی کا سفر و قیام اور صحبتیں

ابھی مولانا کو لکھنؤ میں زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بیوی کا انتقال ہوگیا، یہ حادثہ سخت ترین تھا جس کے صدمے سے خود مولانا کی جان کے لالے پڑگئے، اور وہ تفریح وصحت کے خیال سے بمبئی آتے جاتے رہے بمبئی کے مناظر اپالو اور چوپاٹی کے نظاروں خوبانِ زردشتی کے حسن وجمال اور سب سے زیادہ خاندان طیبجی کی دلچسپ اور علمی صحبتوں نے پچاس برس کی عمر اور ندوہ جیسے مقدس مشغلے کے باوجود جذباتِ شباب تازہ کردیے اور اگرچہ اعادہ شباب تو ناممکن تھا مگر دل کی جوانی لوٹ آئی اور ۱۹ برس سے شعروشاعری کی جو صنعت بھولی ہوئی تھی اب یاد آئی اور دل ودماغ پر چھاگئی یعنی روزانہ کوئی نہ کوئی تازہ غزل تصنیف ہوتی اور دل کا کانٹا زبان سے نکالا جاتا۔

حادثہ گزرندِ پا

مئی ۱۹۰۶ء میں ایک دن جب کہ مولانا اعظم گڑھ میں گھر پر تھے باہر سے اندر جاکر زنانے کمرے میں تخت پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے پاس ہی بندوق رکھی ہوئی تھی جس میں چھرے کے کارتوس تھے مولانا نے اٹھاکر

---

[۱] پہلے وہ علی گڑھ میں مقیم ہونا چاہتے تھے لیکن جب ندوہ ہاتھ میں آگیا تو وہاں چلے گئے۔ (بیانِ مولانا)

دوسرے شخص کو دی، اتفاق سے گھوڑا اڑ گیا بندوق کی زد ٹھیک مولانا کے پانو پہ تھی اور نال سے صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا ٹخنے کی ہڈی بالکل چور ہو گئی اور ایڑی جدا ہو کر جوتے میں رہ گئی فوراً ڈاکٹری امداد آ گئی اور بالآخر عمل جراحی سے نصف پنڈلی جدا کر دی گئی، تین ماہ تک تکالیف اٹھانے اور بستر پر پڑے رہنے کے بعد زخم مندمل ہوا اور بمبئی جا کر مصنوعی پانو بنوایا اور پھر اکثر بمبئی جاتے آتے اور رنگین صحبتوں سے حظ اٹھاتے رہے۔

ندوہ کی ترقی حکومت سے تعلقات امداد اور جلسۂ سنگ بنیاد

باوجود ان حالات کے ندوہ کی ترقی کی تدابیر میں برابر منہمک رہے اور اسلامی ریاستوں اور فیاض مسلمانوں کے علاوہ حکومت سے بھی ۱۹۰۸ء میں علوم دنیوی کی تعلیم کے لیے امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، اور ایک خوش سواد قطعہ اراضی بھی خاص رعایات کے ساتھ حاصل کی لفٹیننٹ حکمران صوبہ کے ہاتھوں سے دارالعلوم کے سنگ بنیاد نصب کرنے کی تقریب بڑی شان سے ہوئی اس موقع پر جو ایڈریس پیش کیا گیا اور جو جواب ملا وہ ندوہ کی تاریخ میں سرکاری تعلقات کی اہم یادگار ہے۔

مولانا نے اس موقع پر علی گڑھ اور ندوہ کو باہم متمسک کرنے کی سعی کوشش کی خود علی گڑھ جا کر خاص اصحاب کو اور سینیر طلبا کو مدعو کیا۔ نواب وقار الملک آنریری سکریٹری کالج صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جوائنٹ سکریٹری کانفرنس ڈاکٹر ضیاء الدین احمد پروفیسر اور دیگر اصحاب اور طلبا کی ایک جماعت نے اس تقریب میں شرکت کی ڈاکٹر ضیاء الدین نے میجک لینٹرن (فانوس جادو) کے ذریعہ سے علماء طلبا کے سامنے جدید علم ہیئت پر لکچر دیا غرض مولانا کی جد و جہد اور انہماک سے سات سال کے عرصے میں ایک طرف ندوہ اور دارالعلوم کو مالی و اصلاحی

حیثیت سے مستحکم کر دیا دوسری طرف حکومت کو اطمینان دلا دیا جدید تعلیم یافتہ طبقے میں
ندوہ کی ضرورت کا احساس ہی نہیں پیدا کیا بلکہ اس کو امداد کی طرف مائل کر لیا حتیٰ کہ
ہز ہائی نس سر آغا خان کو بھی ندوے کے معائنے پر آمادہ کر لیا اور ہز ہائی نس نے
معائنے کے بعد امداد بھی مقرر کر دی۔ ندوہ کے ارکان میں کالج کے آنریری سکریٹری
اور لکھنؤ کے متعدد سابق طلباے علی گڑھ شامل و منتخب ہوئے لیکن بایں ہمہ کچھ ایسے
ارکان بھی تھے جو مولانا کے اثر و نتائج مساعی پر حسد رکھتے تھے اقتدار و اختیار کی
خواہش نے اس آتش حسد کو اور بھڑکا دیا تھا مولانا کا آمرانہ طرز عمل بھی بعض کے لیے
ناقابل برداشت تھا ان وجوہ سے اختلافات پیدا ہوئے جو اندر ہی اندر بڑھتے رہے
ان حالات میں رسالہ الندوہ کے اڈیٹر مولوی عبدالکریم نے جون سنہ ۱۹۱۲ء کی اشاعت
میں جہاد کے مناقب و فضائل پر ایک اداریہ شائع کیا مولانا نے اس زمانے کے
سیاسی حالات اور طرابلس و بلقان کے واقعات کے لحاظ سے اس کو نامناسب تصور کیا
اور چند مقامی ارکان کے مشورے سے اڈیٹر کو معطل کر دیا۔ اب مخالفین کے ہاتھ
میں ایک حربہ آ گیا اور دیگر ارکان نے اس کارروائی کو بے ضابطہ قرار دے کر منسوخ
کر دیا اور مولانا کے خلاف اخباری پروپیگنڈا شروع ہو گیا، اگرچہ دوبارہ ان ہی
ارکان نے دوسرے جلسے میں وہی کارروائی کی جو مولانا نے کی تھی، مگر بایں ہمہ
مولانا مطعون کر دیے گئے اب حالات بہت نازک ہو گئے مولانا کے مذہبی معتقدات
زیر بحث لائے گئے اور ایک کمیشن کی تجویز کی گئی کہ وہ مولانا کے اثرات کی بھی جانچ
کرے جو طلبا پر پڑ رہے تھے۔

مولانا کا استعفا

ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد مولانا نے معتمدی سے مستعفی
ہو جانا ہی مناسب سمجھا اور جولائی سنہ ۱۹۱۳ء میں بمبئی سے استعفا
بھیج دیا۔

بے چینی اور اسٹرائک اور نتیجہ

ندوہ کے انتظامات میں اصلاحات کی ضرورت تھی۔ مطالبۂ اصلاح بھی جاری تھا اب مولانا کے استعفے نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا طلبا میں ہیجان پیدا ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۳ء میں مولانا بمبئی سے لکھنؤ آئے طلبا نے خیر مقدم کا جلسہ کیا اور راستہ میں اپنی تقریریں کیں اور نظمیں پڑھیں جن میں موجودہ ناظم پر چشمک کے قائد تھے اور مخالف ارکان پر حملے تھے۔

طلبا نے خارج اوقات مدرسہ میں مولانا سے بخاری شریف کا درس لینا شروع کیا اس کو حکماً روک دیا گیا اسی طرح سالانہ مجلس سیرت پر قیود عائد کی گئیں، ان وجوہ سے طلبا زیادہ مشتعل ہو گئے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اشتعال پیدا کرنے میں مولانا کے بعض عزیز طلبا نے بھی حصہ لیا بعض کے نزدیک خود مولانا بھی اس شعلے کو بھڑکانے والوں میں تھے۔ مخالفین کے قبضہ میں اس قسم کا تحریری ثبوت بھی موجود تھا۔ بہرحال درجہ میں ایک طالب علم نے اپنے استاد سے گستاخی کی اور اس کی تنبیہ پر طلبا نے اسٹرائک کر دی بعض فارغ التحصیل سینئر طلبا نے اس آگ کو اور بھڑکایا مولانا نے اسٹرائک کی حمایت کی اور ایک مضمون سے مذہبی رنگ دے دیا اخبار الہلال نے جو ایک با اثر ہفتہ وار اخبار تھا طلبا کی حمایت اور مخالفین کے خلاف نہایت سخت اور رکیک مضامین لکھے اور بعض دوسرے اخبارات بھی اس کے ہم نوا ہو گئے اسی طرح مولانا اور طلبا کے خلاف بھی پروپگنڈا جاری تھا، لکھنؤ کا مقامی اخبار مسلم گزٹ سب پر بازی لے گیا تھا ارکان ندوہ نے اس تعلیمی مسئلے میں کانفرنس اور مدرسۂ دیوبند کے ارکان کی امداد کر چکے۔ اب اسٹرائک اور مطالبۂ اصلاحات دونوں سوال نازک ہو گئے۔ اور تمام مسلم پبلک دو حصوں میں منقسم ہو گئی اکئی مہینے کے بعد یہ اسٹرائک ختم ہو گئی اصلاحات کی ضرورت تسلیم کر لی گئی اور اصلاحی کمیٹی قائم ہو گئی۔ لیکن مولانا کا

اب ندوہ سے تعلق نہ رہا۔

سیرت النبی ۱۹۱۲ء میں مولانا نے ایک وسیع پیمانہ پر سیرت النبی کی تالیف کا ارادہ کیا اور الندوہ میں ایک اسکیم شائع کی جس کو بروئے کار لانے کے لئے ایک رقم خطیر کی ضرورت تھی جس وقت یہ اسکیم فردوس آشیاں نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال کے سامنے پیش ہوئی تو حضور ممدوحہ نے کل مصارف کی کفالت فرمائی اور مولانا نے دفتر سیرت قائم کرکے کام شروع کر دیا۔

قانون وقف علی الاولاد مولانا نے وقف علی الاولاد کو قانونی طور پر تسلیم کرانے اور قانونی شکل دلانے میں جو مسلسل اور تھکا دینے والی جدوجہد کی وہ ان کا سب سے بڑا کام اور احسان ہے جس سے بہت سے خاندان اقتصادی تباہی اور جائداد کی بربادی سے نکل گئے اور امور خیر کی آمدنی کا بھی ذریعہ ہو گیا مولانا نے ۱۹۰۸ء میں یہ تحریک اٹھائی تمام علما کو متفق کیا مقننین کی مدد حاصل کی مذہبی نقطۂ نظر سے اس کے مسائل و اصول مدون کئے حکام سے ملاقاتیں کیں جا بجا سفر کئے تب ۱۹۱۳ء تک مجلس مقننہ سے بذریعہ مسٹر جناح یہ قانون پاس ہوا چونکہ قبل ازیں دو مرتبہ یہ تحریک سرسید اور جسٹس امیر علی اٹھا کر ناکام ہو چکے تھے اس لئے یک گونہ مایوسی ہوتی تھی مگر مولانا مایوس نہ تھے حالات بدل چکے تھے وقت مساعد تھا اور کوشش پیہم کامیاب ہوئی۔

دیگر قومی خدمات ۱۹۰۳ء میں جب کانفرنس نے شعبۂ ترقی اردو قائم کیا تو مولانا اس کے معتمد منتخب ہوئے اور باوجودیکہ مولانا حیدرآباد میں ناظم سررشتہ علوم و فنون تھے لیکن اس شعبے کے کام کو دلچسپی سے کرتے رہے اس کی رپوٹیں شائع کیں اور متعدد اچھی کتابیں ترجمہ و تصنیف ہوئیں لیکن دیگر مصروفیات کی وجہ سے ۱۹۰۵ء میں مستعفی ہو گئے ۱۹۱۱ء میں صوبۂ متحدہ کی ورنیکلر اسکیم

کی سرکاری کمیٹی میں جب ممبر مقرر ہوئے تو اردو کے تحفظ میں نمایاں حصہ لیا، اسی سال
مسلم یونیورسٹی کی تحریک اٹھی تو ہز ہائی نس آغا خان کے ہمراہ پنجاب گئے اور لاہور
کے جلسہ میں ایک معرکہ کی نظم پڑھی، فونڈیشن کمیٹی کے بھی ممبر تھے، سرکاری نصاب تعلیم
میں عامتہً جو تاریخیں داخل ہوتی ہیں ان میں دانستہ اور نادانستہ طور پر ایسی غلطیاں
ہوتی ہیں جو مسلمانوں کے خلاف زہر کی طرح موثر ہو جاتی ہیں مولانا نے اس زہر
کے دفعیہ کے لیے ندوہ میں ایک صیغۂ اغلاط تاریخی قائم کرایا، اگرچہ یہ مستقل نہ رہا
تاہم بیشتر کی تاریخ کی اصلاح ہو گئی اور عام خیال ایسی غلطیوں اور اصلاح کی طرف
رجوع ہو گیا۔

مولانا نے فتنۂ ارتداد کے انسداد کی طرف بھی توجہ کی اور ندوہ میں ایک
جماعت خدام الدین بنائی لیکن ارکان کی سرد مہری سے ناکامی ہوئی۔
سنہ میں مولانا کی کوشش سے ایک صاحب نے لکھنؤ سے "مسلم گزٹ"
نامی اخبار نکالا جس میں مولانا بھی مضامین لکھتے تھے ان مضامین میں ایک مضمون
"مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" کے عنوان سے کئی نمبروں میں شائع ہوا جس سے
مولانا کے سیاسی مسلک ہونے کا پہلی مرتبہ پبلک کو علم ہوا۔

مستقل تصانیف

اس دوسرے دور میں بھی مولانا کی مستقل تصانیف کی
کافی تعداد ہے، الفاروق، الغزالی، علم الکلام، الکلام
سوانح مولانا روم، موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم کالج سے جانے کے بعد مختلف
اوقات میں تصنیف کیں، مقالات و مضامین کی بھی بہت بڑی تعداد ہے جن
میں عربی زبان کا رسالہ جو مصر کے مشہور عیسائی متعصب جرجی زیدان کی تاریخ تمدن
اسلام کا تبصرہ تھا متعصب زیادہ اہم ہے جو مصر وغیرہ میں بھی بہت مقبول ہوا
اسے نقاد التمدن کے نام سے عربی میں شائع کیا دوسری تصنیف ہے البتہ فرق یہ ہے کہ

(۱) اول تصنیف کا تعلق خانہ جنگی سے تھا اور اس تصنیف میں غنیم کے حملوں کا جواب تھا۔

سیرۃ النبی کی جلد اول بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی جو اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں جب اس کا دیباچہ الہلال میں شائع ہوا تو حاسد لیکن مولویوں نے شور کیا اور مختلف طریقوں سے کوشش کی کہ بھوپال کی امداد تباہ ہو جائے۔ با ایں ہمہ احتساب قائم ہو کر ناکامی ہوئی۔

سلسلۂ شاعری

بمبئی میں جس شاعری کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ دستہ گل اور بوئے گل پر ختم ہی ختم ہو گیا اور اب تاریخی روایات اور واقعات حاضرہ کو نظم میں ڈھالنا شروع کیا اور ان میں طعن و طنز کی بھی نئی راہ نکالی جو عموماً اپنے مخالف پر ہوتی تھی۔

مکاتیب

مولانا کے مکاتیب کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ دو جلدوں میں مکاتیب شبلی کے نام سے ان کے جانشین مولوی سید سلیمان نے شائع کیا اور دوسرے مجموعے خطوط شبلی کی (جو عطیہ بیگم اور زہرہ بیگم کے نام کے خطوط ہیں) راقم نے اشاعت کی۔

دار المصنفین کی تاسیس

مولانا کی زندگی کا آخری کارنامہ رفیقِ جاریہ ۱۹۱۳ء میں دار المصنفین کی تاسیس کرنا جس کے لیے اپنا باغ اور بنگلہ اور کتب خانہ (جو ندوہ سے بچ گیا تھا) وقف کر دیا تھا۔

انتقال

مولانا نے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء یوم چہارشنبہ کو چند روزہ علالت کے بعد اعظم گڑھ میں رحلت کی اور دار المصنفین کے احاطے میں دفن ہوئے۔

اگرچہ ان کی زندگی طویل و عریض نہ تھی اور صرف ستاون برس کی عمر پائی لیکن
جس قدر زندگی تھی وہ سرتاپا علمی، قومی ہمدردی اور خدمت علم کے جذبے سے معمور
تھی حقیقت میں یہ سرسید کا ہی فیضان صحبت اور علی گڑھ کی تربیت کا نتیجہ تھا،
اس دور میں اور بھی بڑے بڑے علما پیدا ہوئے لیکن کوئی دوسرا شبلی نہ ہوا جس نے
علمی و قومی کارنامے اتنے ہمہ گیر، اتنے روشن ایسے دلیل راہ اور اتنے پائدار ہوں،
اگر شبلی اس راستے پر نہ پڑ جاتے جس کو نواب صدر یار جنگ نے ان کے علامہ
شبلی بننے کا راستہ قرار دیا ہے اور وہ تربیت و فیض حاصل نہ کرتے جس نے علامہ شبلی
کے ہی اعتراف کے مطابق ان کو شبلی بنا دیا تو عام ملاؤں یا نیم علما یا علمائے حنفیہ
کی ہی طرح مناظروں اور قوم میں انتشار و خلفشار پیدا کرنے میں ہی زندگی گزار دیتے
وہ وہ روشنی نہ دیکھ سکتے جو انھوں نے دیکھی اور دوسرے علما کو دکھانی چاہی۔
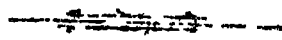
ایشیائی اور اسلامی طرز حکومت

شاید اس میں کسی کو اختلاف نہیں اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ ایشیا
کے تمام ملکوں میں ہمیشہ حکومت شخصیہ ہوتی آئی ہے جس کو یورپ کی زبان میں (مانرکی)
کہتے ہیں یعنی وہ حکومت جس میں حکومت کی اعلا قوت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو جس
کو بادشاہ یا راجہ سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر یہ بات غور کے لائق ہے کہ جزیرۂ عرب میں
بہ زمانۂ جاہلیت یعنی قبل اسلام کیا طرز حکومت تھی اور اسلام نے اس میں کچھ تبدیلی
کی تو کیا طرز حکومت قرار دی۔

زمانہ جاہلیت کی تاریخ بہت کم ملتی ہے مگر جس قدر ملتی ہے اس سے ظاہر ہوتا

نہ زمانہ جاہلیت میں شیوخ یعنی سرداران قبائل کے ہاتھ میں ہر ایک قبیلے کی حکومت ہوتی تھی۔ جو شخص بسبب دولت یا بوجہ کسی صفت کے تمام قبیلے میں اعلیٰ گنا جاتا تھا وہی اس قبیلے پر حکومت کرتا تھا اور مجموع شیوخ تمام قبائل کے جزیرۂ عرب اسی طرح حکومت کرتے تھے صلح و جنگ، انفصالِ خصومات بالکلیہ انھی شیوخ کے ہاتھ میں تھا اس طرزِ حکومت کو یورپ کی زبان میں (آلی گارکی) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس میں اعلاقوت حکومت کی چند عالی رتبہ نام وراعما کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

زمانۂ اسلام میں آں حضرت صلعم کے وقت تک یہی طرزِ حکومت قائم رہی۔

تمام قبائل جزیرہ عرب کے اسلام لاچکے تھے اور عرب کے قبائل میں جو جدا جدا شیوخ ہوتے تھے ان کا تعدد اسلام نے کے توحد نے مٹا دیا تھا اور صرف ایک ذاتِ پاک آنحضرت صلعم کو کل قبائل نے اپنا شیخ اور پیغمبر قبول کیا تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ رسالت کے ساتھ جزیرہ عرب کے کل قبائل کی حکومت بھی لازماً حسب دستور جزیرۂ عرب آں حضرت صلعم سے از خود منضم ہو جائے اور مثل ایک شہنشاہ یا شیخ الشیوخ کے ملکی و تمدنی امور کا انتظام بھی آں حضرت صلعم کے ہاتھ میں رہے۔

یہاں تک جو طرزِ حکومت عرب کا بذریعہ شیوخ کے زمانۂ جاہلیت میں تھا اس کے اصول میں کچھ فرق نہیں آیا تھا بجز اس کے کہ جدا جدا قبیلوں کے جو جدا جدا شیوخ تھے بسبب متحد ہو جانے قبائل کے وہ تعدد معدوم ہو گیا اور ایک ہی شیخ تمام قبائل کا ہو گیا جس کے ہاتھ میں کل جزیرۂ عرب کی حکم رانی تھی بے شک اس طرح پر کل قبائل کا جو مختلف مذاہب رکھتے تھے اور ان کے آپس میں نسلاً بعد نسلاً عداوتیں چلی آتی تھیں متحد ہو جانا ایک کرشمۂ ربانی تھا جس کی نسبت خدا نے فرمایا۔

مگر بحث اس میں ہے کہ اسلام نے کوئی طرزِ حکومت قرار دی اور اگر کوئی قرار دی تو اس پر کیا عمل درآمد ہوا اس زمانے کے تعلیم یافتہ جو سب سمجھے دی پبلک اصول

کی طرف رجحان رکھتے ہیں اور مجھ کو کہنا چاہیے کہ اسی کے قریب قریب اہل سنت وجماعت
کہتے ہیں کہ آں حضرت صلعم نے طرزِ حکومت انتخاب کے اصولوں پر چھوڑ دی تھی یعنی جس
کو سب لوگ منتخب کریں وہی حاکم یا امیر یا خلیفہ یا سلطان قرار پاوے اور اطاعت
حکومت اسی کے ہاتھ میں ہو جو ری پبلک کا اصول ہے مگر اس اصول کو اسلام
سے متعلق کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ کوئی ثبوت اس کا نہیں ہے کہ آں حضرت صلعم نے
فرمایا ہو کہ میرے بعد لوگ جس کو انتخاب کریں وہ میرا جانشین ہو اگر فرض کیا جاوے
کہ آں حضرت صلعم نے امر جانشینی کو بلا کسی ہدایت کے چھوڑا تھا تو یہ کہا جائے گا
کہ جانشینی کی نسبت کوئی ہدایت نہیں کی تھی نہ کسی کے استخلاف کی نہ انتخاب کی
نہ جانشینی کی نسل یا قرابت قریبہ میں ہونے کی۔

علاوہ اس کے ری پبلک کا اصول یہ ہے کہ کل لوگ خود یا بذریعے اپنے نائبوں
کے انتخاب میں شریک ہوں مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جو لوگ
جمع تھے اور جہاں حضرت ابوبکر جانشین قرار دیے گئے تھے وہ لوگ عام لوگوں کی
طرف سے کسی جانشین کے مقرر کرنے کے مجاز نہیں ہوئے اور نہ ان لوگوں نے اپنا
ریپریزنٹیٹیو مقرر کیا تھا اور اس کے لیے لازم آتا ہے کہ وہ انتخاب ری پبلک اصول
پر نہ تھا اور اسلام نے کوئی ری پبلک طرزِ حکومت قرار نہیں دی تھی نہ اس پر
عمل درآمد ہوا۔

اہل سنت وجماعت بجائے لفظ ری پبلک کے لفظ اجماع امت استعمال
کرتے ہیں اور حضرت ابوبکر کی خلافت باجماع امت قرار دیتے ہیں مگر کلام اس میں
ہے کہ آیا اسلام نے یہ طرزِ حکومت قرار دی ہے یا نہیں اگر ہم تسلیم کریں کہ یہی طرزِ حکومت
اسلام نے قرار دی تھی تو اس میں کئی مشکلیں پیش آتی ہیں اول یہ کہ اجماع امت کسی
امر پر متحقق ہو ہی نہیں سکتا دوم یہ کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں تمام وہ لوگ جن پر اہل حل وعقد

ہونے کا اطلاق ہو سکے جمع نہ تھے اور بعد جانشین ہو جانے کے لوگوں کا ان کی حکومت کو تسلیم کر لینا اجماع مطلوبہ میں داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ بعد حاکم ہو جانے کے ہر ایک حاکم کی حکومت لوگ تسلیم کر لیتے ہیں وہ تسلیم اجماع مطلوبہ داخل نہیں ہو سکتی۔ سوئم یہ کہ حضرت ابوبکر صدیق رض نے حضرت عمر رض کو اپنی اخیر زندگی میں اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کیا ان کی ولی عہدی خلافت کا فرمان جاری کیا لیکن اگر خلافت مسلمانوں کے انتخاب پر چھوڑی ہوتی تو حضرت ابوبکر رض اپنا ولی عہد خود مقرر کرتے۔

ہاں ایک اور معقول دلیل اہل سنت و جماعت پیش کر سکتے ہیں محققین علماء اہل سنت و جماعت کا اجماع کی نسبت یہ مذہب ہے کہ اجماع منعقد ہونے کے لئے کوئی اصل قرآن یا حدیث میں موجود ہونی چاہیئے یعنی قرآن و حدیث میں کوئی حکم ہو جو بطور نص قطعی کے نہ ہو بلکہ اس میں کچھ ابہام ہو تو اجماع اس ابہام کو رفع کر کے اس حکم کو قطعی کر دیتا ہے اس صورت میں حضرت ابوبکر رض کی خلافت پر اجماع ہونے کی یہی مراد لی جا سکتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے زمانہ علالت میں حضرت ابوبکر رض کو بجائے اپنے نماز پڑھانے کا حکم دیا اور نماز میں اپنا خلیفہ مقرر کیا اس حکم میں یہ ابہام رہا کہ اس سے آنحضرت صلعم کا منشا اپنے بعد بھی حضرت ابوبکر کا خلیفہ ہونا تھا یا نہیں اس پر اجماع ہوا اور حضرت ابوبکر بہ استخلاف خلیفہ ہوئے اگر یہ دلیل تسلیم کر لی جائے تو لازم آتا ہے کہ اسلام نے طرز حکومت کو انتخاب کے اصول پر نہیں قرار دیا تھا بلکہ استخلاف کے اصول پر قرار دیا ہے۔

شیعہ تو اس سے بھی زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہیں وہ خلافت یا امامت کا تقرر من اللہ قرار دیتے ہیں اور طرز حکومت اسلامیہ کو استخلاف پر منحصر کرتے ہیں اور مدعی ہیں کہ استخلاف حضرت علی مرتضیٰ رض کے حق میں ہوا تھا مگر اس مقام پر ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں ہے کہ استخلاف کس کے حق میں ہوا تھا حضرت ابوبکر صدیق رض کے

حق میں یا حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے حق میں بلکہ صرف یہ مقصود ہے کہ ان دونوں مذہبوں سے اسلامیہ طرز حکومت استخلاف پر مبنی ہوتی ہے نہ انتخاب اور پبلک اصول پر۔

حضرت عمرؓ نے بھی اخیر وقت پر متعدد لوگوں کو استخلاف کے لئے نامزد کیا مگر زندگی نے وفا نہ کیا ورنہ ان میں سے ایک کو متعین کر دیتے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ نے بھی اپنی مرضی حضرت امام حسنؓ کے استخلاف پر ظاہر کی مگر بہ لحاظ حالات زمانہ اور واقعات موجودہ کے جو کچھ تردد تھا یہ تھا کہ وہ چل بھی سکے گی یا نہیں ہماری دانست میں اگر ابتدا ہی سے اصول حکومت فی النسل بطور اصول لمیٹڈ مانرکی کے قائم ہوتا تو اتنا جلد زوال نہ آتا۔ الائمۃ من القریش اگر حدیث صحیح ہو تو اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ خلیفہ اربعہ میں سے کسی نے کبھی انتظام حکومت اور اجرائے احکام سلطنت کو تابع رائے عام نہیں کیا بلکہ صلح و جنگ وغیرہ تمام امور صرف اپنی رائے اور مرضی کے موافق انجام دیئے اور سب نے ان کے حکم کی اطاعت کی اور یہ طرز حکومت وہ ہے جس کو زمانہ کی یعنی سلطنت شخصیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ایک اصول بھی طرز حکومت ریپلک کا اس پر صادق نہیں آتا۔

اس تمام بحث سے ہمارا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام نے طرز حکومت ریپبلک اصول پر قائم کی تھی اور مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا اس لئے ان پر زوال آیا یہ صحیح نہیں ہے بلکہ خلافت حضرت عمرؓ میں جو یقینی بہ استخلاف قائم ہوئی تھی جو شان و شوکت و ترقی اسلام و مسلمانوں کی ہوئی اس کی نظیر کسی خلافت یا بادشاہت میں پائی نہیں جاتی۔

ختم نبوت کے بعد خلافت فی النبوت باقی نہیں رہی تھی ہاں مسلمانوں کے امور تمدنی کے انتظام کو کسی امیر کا ہونا ضرور تھا اور یہ ایک دنیاوی امر تھا نہ مذہبی اور اس لئے

اسلام نے کوئی طریقہ اس کے لئے مقرر نہیں کیا۔ حق یہ ہے کہ تنزل مسلمانوں کا خود ان کے افعال سے ہوا ہے۔ مگر اس زمانہ میں ہم کو اس زوال کے اسباب سے بحث محض فضول ہے کیونکہ وہ زمانہ عود نہیں کر سکتا بقول ہمارے معزز دوست مولوی حشمت اللہ صاحب ایم۔ اے کے کہ "گری قوموں کے سورج کو ڈوب کر پھر نکلتے نہیں دیکھا" مصر، ایران، کارتھیج، بابل، یونان اور مقدونیہ میں جو ظلمتیں ایک مرتبہ چھا ئیں وہ آج تک نہ کھلیں گو وہ ہی زمین و آسمان رہے مگر نہ مصر کو کلوپٹرا نہ یونان کو وہ ارسطو نہ مقدونیہ کو وہ سکندر نہ روم کو وہ جولیس سیزر نہ ایران کو وہ کیقباد نہ کارتھیج کو وہ ہنی بال نہ بابل کو وہ بخت نصر میسر آئے ہم کو اپنے مطلع کا بھی یہی ڈر ہے۔ رفعت سلطنت کے جاتے رہنے کے بعد یہ امر قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے کہ فلک اسلام پر پھر خالد، ضرار، عقبہ، ابو عبیدہ، سعد، موسیٰ یا طارق جیسے ثوابت و سیارے پھر چمکیں، مگر اتنا دیکھنا ہے کہ حالات موجودہ کے زلزلے جو سب طرح سے مایوسی فزا ہیں سطح معمولی پر بھی قائم رہنے دیتے ہیں یا نہیں"۔ پس ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں اور موجودہ حالت میں جو ہندوستان کی اور قومیں ترقی کر سکتی ہیں اور مسلمان تنزل کی حالت میں ہیں ان کے اسباب کیا ہیں اور انھی موانع کو دور کر کے ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ ہماری قوم اس تنزل سے نکلے اور کم سے کم یہ کہ مثل دیگر قوموں کے ترقی کے میدان میں گوئے سبقت لے جاوے۔

اس وقت ہماری قوم اگر مسٹر آکلینڈ کالون کی نصیحت پر عمل کرے تو بے شک اس کو کامیابی ہو سکتی ہے انھوں نے کہا ہے کہ "مثل ہے کہ جب آدمی بدل جاتے ہیں تو ان کے اوضاع و اطوار بھی ساتھ ہی بدل جاتے ہیں خاندان تیموریہ کی تلوار اگر اب بالائے طاق رکھی جاوے تو وہ مستعدی، استقلال و دلیری اور برداشت جو اس تلوار کے جوہر تھے اب بھی کام آ سکتے ہیں جو کچھ آجکل مسلمانوں کو قائم رکھنا چاہیئے وہ ان کے

آبا و اجداد کا تند اور متعصبانہ جوش نہیں ہے بلکہ وہ بڑے اوصاف ہیں جنھوں نے اس تند اور متعصبانہ جوش کو فرمانروائی کے قابل بنایا تھا۔ وہ اوصاف کامیابی حاصل کرنے کے اب دوسرے مقاصد کے حاصل کرنے میں صرف کرنے چاہئیں"۔

ہمارے باپ دادا نے شخصیہ حکومت برتی ہو یا جمہوری پھر انھوں نے جمہوری اصول کو توڑا ہو یا سرے سے اختیار ہی نہ کیا ہو وہ گذر گئے اور جو کچھ ان کو اچھا یا برا کرنا تھا وہ کر گئے ہم کو اپنا زمانہ بھگتنا ہے پس ہم کو وہ تدبیر کرنی چاہیئے جو اس زمانہ کے حسب حال ہو اور اس کے سبب ہماری قوم موقر و خوش حال رہے ہمکو اب اگلی حکومت کے خواب دیکھنے نہیں چاہئیں بلکہ اس بات کی فکر چاہیئے کہ ہم کو ایک معزز اور ممتاز وفادار رعایائے ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ ایمپریس آف انڈیا ہوکر کس طرح اپنی ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے یہی ہمارا فرض از روئے مذہب کے ہے اور یہی راہ ہماری ترقی و خوش حالی کی ہے۔

باہتمام محمد سعید صدیقی

(ادبی پریس لکھنؤ میں چھپی)

تعلیق

(متعلق صفحہ ۵۶)

(۱) 'الفاروق' کے سلسلۂ بیان میں حاشیہ صفحہ ۲۳۱ 'حیات شبلی' پر مولانا شروانی کی جو تائید درج ہے اس میں تو لکھا ہے کہ "یہ واقعہ خود سرسید نے مجھ سے بیان کیا تھا" مگر نواب عماد الملک کی لائف کے سلسلہ میں مولانا شروانی نے اپنے قلمی خط مورخہ ۲۰ راپریل ۱۹۳۲ء "موسومہ سید ہاشم ندوی" میں عبارت کے کسیقدر فرق سے لکھا ہے کہ "الفاروق کے متعلق علامہ شبلی مرحوم نے واقعہ ذیل مجھ سے بالمشافہ بیان کیا تھا جو مجھ کو خوب یاد ہے اور تاامکان وہی الفاظ لکھتا ہوں"۔

آخر میں سرسید کی تحریر کے متعلق یہ نوٹ بھی ہے کہ "میں نے وہ تحریر اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی" یا تو مولانا شروانی کی تحریری تائید میں تصرف کیا گیا یا خود مولانا شروانی کے حافظہ کی غلطی ہے۔

(۲) متعلق صفحہ ۱۶۱ رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۵ء میں جبکہ نواب عماد الملک زندہ تھے اور انہیں کی ہشتاد سالہ جوبلی میں یہ نمبر شائع ہوا تھا، مولوی عبدالحلیم شرر (جو مولانا کے خاص دوستوں میں ہیں) لکھتے ہیں کہ:-

"مولوی شبلی نعمانی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے الفاروق کو شائع کیا تو اسکا ایک نسخہ نواب عماد الملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور خواہش کی کہ اسکی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں، اسکے جواب میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ:-

"گزشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر بن الخطاب ہے لہذا ان کی لائف لکھنا اسلام کی خدمت تھی جس کو آپ نے ادا کیا"

اس دو حرفی تبصرہ سے صاف ظاہر ہے کہ محض سرسید پر حملہ کے لئے ان کی اختلاف کو یہ ایسی زور شور ظاہر کیا گیا۔ اور حملہ میں زور پیدا کرنے کے لئے عماد الملک کا نام درمیان میں لایا گیا۔

صفحہ ۹۱۔ زمانہ سرسید کے جن طلبار کا نام درج ہے۔ ان میں ایک سب سے بڑا نام ڈاکٹر حامد علی (نواب حامد نواز جنگ) کا ہے جنہوں نے متفرق طور پر بیش قرار امداد کے علاوہ چار پانچ سال ہوئے کہ اپنا تمام سرمایۂ عمری تقریباً تیرہ لاکھ روپیہ کا سرمایہ مسلمانوں کے تعلیمی وظائف کے لئے حکومت نظام کو تفویض کر دیا۔

ندوہ کو قائم ہوئے بھی پچاس سال گذر چکے اس کے طلبار اور حامیوں میں بڑے بڑے مالدار رؤسار اور ذی ثروت ہیں کیا کوئی مثال متذکرہ اصحاب میں سے کسی مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے، خود مصنف سوانح نے آخری عمر میں جب کہ ندوہ کو بھی ان کی سخت ضرورت تھی اور دار المصنفین کے لئے زندگی وقف کر چکے تھے بھوپال کے عہدۂ قضا وغیرہ کے گرانقدر مشاہرہ کو ترجیح دے کر ملازمت اختیار کر لی۔

برخلاف ان کے اسی کالج کے ایک نامور اور قابل ترین اولڈ بوائے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایم اے۔ پی، ایچ، ڈی شیخ جامعہ ملیہ (دھلی) نے قوم کی تعلیمی خدمات اور جامعہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے اسی زمانہ میں جب کہ علامہ موصوف مسند قضا پر جلوہ افروز ہوئے حکومت ہند کی ممبری کی پیشکش کو مسترد کر دیا جس کا اقتدار و مشاہرہ علامہ کے عہدہ سے بدرجہا زیادہ تھا۔ ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔